

اللَّهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ

قرآنی حقائق

تصوف کے آئینہ میں

از قلم

ترجمان حقیقت حضرت قبلہ صاحبزادہ محمد عمر صاحب مدظلہ

(بیرویل شریف - ضلع سرگودھا)

الْأَلِفُ تَصَوُّفٌ

نظام بلڈنگ - موہنی روڈ - لاہور

451/2

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

تعارف

قرنہا باید کہ تا صاحب دے پیدا شود

بایزید اندر خراسان یا اولیں اندر قرن

مقصود کن نکان حق آگاہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے اور یہی دولت عرفان ہے جو کبھی الہام ربانی کو جذب کرتی ہے اور کبھی سینے کے سونٹے کھولتی ہے یہی نور اعظم جسیم عالم میں آنکھ کی پتلی ہے اور قلب جہان کے لیے سامانِ حقیقت، اس کا قلیل بھی کثیر ہے۔ اور اس کا کم تر بھی برتر و اعلیٰ۔

مروحق آگاہ اُمت مرحومہ میں مسند رسالت کا جانشین اور خلافت نبوت کا مستحق اولین ہے۔ عُلَمَاءُ اُمَّتِيْ كَانِبِيَا بَنِي اِسْرَائِيْلَ كِي بَہترین سند فخر و عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زبان سے زمانہ کے جن جبیدوں اور بایزیدوں کو عطا ہوئی ان کی تعداد ہر دور میں تعجب انگیز قلت میں رہی ہے اور پھر اس قلت کو کم آمیزی سنے اور بڑھایا۔

اس راستے میں قلت الاختلاط مع الانام رلوگوں سے کم ملنا ملنا، فیداجوئی

اور مقصدوری کا لازمہ قرار پایا۔

خودی را مردم آمیزی دلیل نارسائی یا تو لے درواشنا بیگانہ شوا از آشنائی یا اور مردان کامل نے اپنی بلندی کو چشمِ ظاہرین سے چھپانے کے لیے اپنی روش میں نشانات ظاہر کو ترک کرنا محبوب قرار دیا۔

از جدول شوا آشنا از بروں بیگانہ روش ایں چنین زیبا روش کم تر بود اندر جہان

اکثر ایسا ہوا ہے کہ ولایت و عرفان گوڈری میں لعل بن کر چھپے رہے ہیں۔ اور محروم
حسرت نگاہیں ہرگز گوڈری کو دیکھ کر لعل مقصود سے محرومیت کا داغ لے لیں۔

لیکن ہمدردی اور بلندی اشتہاد نے طالب حق کو مرد کامل کی تلاش میں
کامیاب کیا۔ اور ظاہر کی بیگانہ و شنی حسن و جمال باطن کا پردہ نہ بن سکی اور محسوس نگاہوں
نے سادگی کے بھیس میں حسن و جمال باطن کی سب باریں دیکھ لیں۔

لاکھ چمپس بن سنور کر ماہ رویان جمال سادگی پران کی قربان ساز و سامان جمال
آج جس جنید زمانہ اور باریز وقت، قطب العالم کا تعارف مقصود ہے اس کی
ذات گراچی اسی نسبت کے غلبے سے چشم عالم سے پوشیدہ رہی ہے۔ علم ظاہر میں
قدیم و جدید علوم کا دریا سینے میں ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور معرفت و محبت الہی میں اپنی
مثال آپ ہیں اور ظاہر و باطن کی برزخیت کے اس نور البشر کی ادنیٰ خصوصیت
یہ ہے کہ آپ کی نگاہ کیمیا اثر پہلی حاضری میں دل کے میل کھیل و عودیتی ہے۔ اور
حسرت و نیا کی چٹکار میں آیا ہوا انسان محبت الہی کی خوبصورت وادی میں پہنچ جاتا ہے
اور ہوائے نفس کا شکار شاہ بازار طریقت بن جاتا ہے۔ اور اقبال مرحوم کے اس نظر
کو آپ کی نگاہ حق میں سامنے لاکھڑا کرتی ہے۔

اگر اب بھی شعیبؑ آسے میسر شہابی سے کلمی دو قدم ہے
طلب مولانا میں اپنی ہمت آزمانے والا عالم ہو خواہ ان پرہ و دونوں اس نگہ باز
کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ پھر دونوں اپنے حال میں مست ہو کر فنا و بقا کی تکمیل
میں لگ جاتے ہیں۔

اس تحریر کا مقصود اور ہمارے محبت بھرے جذبات قلبی کا مور و قطب العالم
تحمیب الہی سیدنا و مرشدنا حضرت ماسیزاد و محمد عمر صاحب مدظلہ العالی ہیں۔
آپ اپنے جد امجد شاہ بازالامیکان حضرت حافظ غلام مرضی صاحب زیر بلوی رحمۃ اللہ علیہ

طالبان حق کے سامنے لائے۔ انشاء اللہ العزیز آپ ان مقدس تحریروں کو پڑھنے کے بعد ہمارے ہم نوا ہو جائیں گے اور اگر غلط روش رکھنے والے تصوف کی غلط نقالی سے آپ اصل حقیقت کے پرتو سے محروم ہیں تو اس صحیح رہنمائی کو غنیمت سمجھیں گے اور اس انداز فکر کو اسلام کے لیے تجدیدی کارنامہ کہیں گے۔ اور اگر آپ کا ذہن حقیقتِ اسلام اور روحِ ایمان یعنی تصوف سے کسی غلط اندیش یا ناواقف حال صاحبِ قلم کی غلط تعبیرات کے سزاوار ہے متاثر ہو کر نفرت پکڑ چکا ہے تو آپ حضور کی مبارک تحریریں پڑھ کر تمام غلط فہمیوں سے پاک صاف ہو جائیں گے۔ اس وقت تک ادارہ تصوف رب سلسلہ قرآنی حقائق حضور کی مندرجہ ذیل تحریرات شائع کر چکا ہے۔

قرآنی نظریہ حیات جنتی لؤل۔ خانقاہی تصوف کا پورا خاکہ صحیفہ قرآنی میں حصہ دوم طریقت کی حقیقت قرآن حکیم کی روشنی میں، حصہ سوم زیر نظر کتاب۔

حضور قبلہ عالم کی بعض تحریرات پہلے شائع ہو چکی ہیں مثلاً صراطِ مستقیم وغیرہ۔

زیر نظر کتاب طریقت کی حقیقت قرآن مجید کی روشنی میں بہت سے ایسے حقائق کا مجموعہ ہے جو اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ علمائے مفسرین۔ جہاں کہیں حال اور کوائف کے متعلق کوئی قرآنی بیان سامنے آیا نہایت خاموشی سے قلم چھکا کر نکل گئے۔ اور حقیقت انہیں مقامات کی تشریح حقیقت تصوف کا بیان تھا۔ جب پڑھنے والے صرف لفظی ترجمہ یا مختصر اور بے ربط تشریح پڑھتے ہیں تو قرآن کے ان مقامات کو بھی متشابہات کی ذیل میں شمار کرتے ہیں اور حقائق کا طالب اپنی پیاس موجود پاتا ہے۔

مثلاً موسیٰ اور خضر کا واقعہ۔ اصحابِ کعبہ کا قرآنی قصہ وغیرہ

ادارہ تصوف امید کرتا ہے کہ ناظرین اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اپنی قیمتی آراء

سے مطلع فرمادیں گے۔ اور ہمیں نمونہ فرمادیں گے۔

ناظم ادارہ تصوف موسیٰ روڈ
نظام بلڈنگ۔ لاہور

یہ چلا کتاب

جو آپ کی خدمت میں پہنچیں گی وہی صحیح مندرجہ ذیل رسائل پر مشتمل ہے

- ۱۔ قرآنی نظریات صفحہ ۳۰ - ۱
- ۲۔ خانقاہی تصوف کا پورا خاکہ صحیفہ قرآن میں ۵۶ - ۳۱
- ۳۔ طریقت کی حقیقت قرآن حکیم کی روشنی میں ۲۰۸ - ۱
- ۴۔ اٹھویں ۱۶ - ۱

ان رسائل میں قطب العالم محبوب الہی مرشدنا حضرت قبلہ صاحبزادہ محمد عمر صاحب مدظلہ سجادہ نشین خانقاہ مرصوبہ بیربل شریف ضلع شاہ پور سے جانِ اسلام و ایمان یعنی خقائق تصوف کو کھول کر بیان فرمایا۔ اور موجودہ دنیا کے شکوک سے بھرے ہوئے ذہنوں کو صاف کرنے کے لئے بلند احوال کو نہایت پُر اثر پیرایہ میں بیان فرمایا۔

ادارہ تصوف نے طالبان حقیقت کے لئے انہیں شائع کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ اُمتِ مرحومہ کے اولیائے کرام نے اسلام کی جو خدمت انجام دی ہے۔ اس سے ایک نیا واقف سہان پاک نفوس کے جذبہ ایمانی کی بنیاد یہی خقائق تھے جو ان رسائل میں درج ہیں۔ آپ انہیں بار بار پڑھیں خدا کرے آپ کی عزت بار آور ہو اور حقیقت کے چہرہ سے آپ کے سامنے پردہ اٹھ جائے۔

مہتمم
ادارہ تصوف

سکونِ قلبِ بڑی دولت ہے۔

لیکن

یہ نعمت بادشاہ کو اپنی وسیع سلطنت کے باوجود نصیب نہیں

اور

یہ نعمت آپ کو ایک فقیرانہ جھونپڑی میں نصیب ہو سکتی ہے

وہ کیسے طرح؟

اپنی زندگی کے لمحات کو ان خطوط پر ڈھالیں

جو یہ کتاب آشکارا کرتی ہے

(پنجاب ڈیپریٹمنٹ)

اعلاط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۴	۱۶	در حقیقت	دریافت
۵۶	۳	لب	سب
۶۳	۳	جب سے	جب سے
۶۳	۶	ارادہ بندے	ارادہ بندہ
۱۶۴	۱	ارات مند	ارادت مند
۱۶۶	۱۱	پھینے	پھیلین
۱۶۶	۱۶	بل	بل بوتے
۱۶۸	۱۳	الدنیا	حُب الدنیا
۱۶۸	۱۴	دنیا	حُب دنیا
۱۸۰	۱۶	بنیوا	بے نوا
۱۸۴	۱۱	بہت مصلحین	بہت سے مصلحین
۱۸۴	۱۳	حیثیت جائیگی	حیثیت آجائے گی
۱۸۴	۱۶	کس درجہ کرتی ہے	کس درجہ اتفاق کرتی ہے
۱۸۶	۱۶	انمام	اتمام پر
۱۸۶	۱۵	پڑ ہے	پڑ ہے
۱۸۸	۳	مسلمان	مسلمانوں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۸۸	۵	احیثنی	احیثنی
۱۸۸	۱۹	کر کے	کر
۱۸۹	۱۶	دین کی مدار خیال کو جائے	دین کا مدار خیال کیا جائے
۱۹۲	۸	انبیاء	انبیاء
۱۹۴	۱۴	صرف کر دی	صرف کر دی
۱۹۵	۳	خود اٹھ جائیں	خود بخود اٹھ جائیں
۲۰۱	۱۹	چمکتے	چمکنے

فہرست مضامین طریقت کی حقیقت

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۳	سجاہد سے اور ریاضتیں نبیوں کی سنت ہیں	(۱)	تعارف
۴۵	طریقت کا معاہدہ	۱	پیش لفظ
۴۵	تمثیلی حکایت	۱	مذہب کیا ہے
۴۸	معاہدہ کے بعد سفر	۶	پس نظر
۴۹	خضرؑ کی صورت (پہلا سبق)	۸	سورہ کہف کے تین قہقے
۵۰	دوسرا سبق	۹	قہقہ خضر و موسیٰ علیہما السلام
۵۱	تیسرا سبق	۱۲	خضرؑ کی تعلیم کی ضرورت
۵۱	بے صبری پر بے صبری	۱۳	حضرت سلیمانؑ کا ایک سوال
۵۵	توحیدی آب حیات کے مختلف رنگ	۱۵	شریح کی تفصیل
۶۹	تذکیر	۱۵	نسبت عیسوی و موسوی کا فرق
۶۹	شریعت اور طریقت کا فرق	۱۶	قرآنی توحید
۶۹	طریقت بلند استعداد لوگوں کے لئے ہے	۱۷	لفظی اور علمی توحید
۷۰	طریقت کے لئے عفت ضروری ہے	۲۰	کرامت کی حقیقت
۷۰	طریقت باطنی مشاہدے کا دوام ہے	۲۲	علم لدنی کیا ہے؟
۷۰	صاحب طریقت کو کیسا ہونا چاہیے	۲۳	ظاہری و باطنی علم کا فرق
۷۱	صاحب شریعت کے تاثرات	۳۸	نسبت تکوینی
۷۱	شریعت حقہ کی حفاظت کا سامان	۴۰	نسبت خضریٰ
۷۲	علمائے حقہ موسوی مشرب ہیں	۴۱	زید اور پیر
۷۲	اہل طریقت بھی اکثر اہل شریعت ہیں	۴۷	رشد
۷۳	تذکیر نفس مقدم ہے	۴۳	طریقت کے مجاہدے
۷۳	تذکیر نفس کی طرف سے بے توجہی		
۷۳	نجات کا مدار تذکیر پر ہے		
۷۴	تذکیر نفس صاحب تذکیر کا فن ہے		

ب

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۸۴	علم اور ارشاد کا فرق	۷۵	پارہ اول میں تزکیہ کو موخر کیوں رکھا گیا؟
۸۵	بیعت کی اصل	۷۵	بیغیر کی تربیت میں تزکیہ کا درجہ اول ہے
۸۶	تصوفِ قدیم اور بعد کے تصوف میں فرق	۷۵	نفسانی امراض کا علاج تزکیہ کے سوا
۸۶	بیعت کا بہترین مفہوم	۷۵	کیا ہو سکتا ہے
۸۷	بیعت اسلام میں داخل ہونے کیلئے مہتمی	۷۶	تزکیہ نفس اسلام کے اجزائے ضروریہ سے ہے
۸۷	بیعت طریقت بھی ایک عہد ہے	۷۶	طریقت خدمتِ خلق ہے
۸۸	موجودہ بیعت کا ایک نقص	۷۶	مرشد و ارشاد سے بڑھ کر کسی
۸۸	مرشد کون ہو سکتا ہے؟	۷۷	خدمتِ خلق ہو سکتی ہے
۸۸	مرشد کی روحانی اولاد اور جسمانی اولاد	۷۷	ذکر الہی ساک کا اس المال ہے
۸۹	حضرتی کا اصل مفہوم	۷۸	ذکر کثیر سے دل منور ہوتا ہے
۹۰	ایمان کی حقیقت	۷۹	دل خواہشات سے نکل کر انور میں
۹۱	طریقت میں چون و چرا کی اجازت نہیں	۷۹	داخل ہو تو یہی معرفت الہی ہے
۹۲	قصہ موسیٰ و حضرت میں خاموش رہنے کی حقیقت	۷۹	احکام شریعت معرفت کا پہلا قدم ہے
۹۳	مرشد کے سامنے تسلیم و رضا	۷۹	سلاطین عالم ذکر کے نور کے سامنے جھکتے
۹۳	کی حکمتِ اعلیٰ	۸۰	موسے علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام
۹۳	لفظ مرشد کا ماخذ	۸۰	کے پاس کیوں بھیجا گیا؟
۹۴	غیب دانی اور اولیاء اللہ	۸۰	مرشد کی ضرورت
۹۴	امور مستکہ اور ساک	۸۱	مرشد کامل کا نشان کرامت ہے
۹۶	معیت کا درجہ	۸۲	مرشد حق کے کارنامے
۹۶	معیت میں ایک بڑی مشکل	۸۲	فیض ظاہر و باطن کی تقسیم
۹۶	مرشد کے ہر فعل کو حکمت الہیہ تصور کیا جائے	۸۲	بیعت طریقت کا ثبوت قرآن کریم ہے
			علم لدنی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۰۷	مرید کی اپنے پیر سے طبعی مناسبت	۹۷	سعیت میں صبر مقصود ہے
۱۰۷	انا فانا کامل بنا دیتی ہے	۹۷	کو فواع الصادقین سے کیا مراد ہے؟
۱۰۷	علم اور چیز ہے اور فقر کی استعداد اور	۹۸	طریقت کی پہلی منزل صبر ہے
۱۰۸	ظاہر و باطن کا استخراج	۹۸	اور دوسری رضا ہے
۱۰۹	شریعت جسم ہے اور طریقت جان ہے	۹۸	حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
۱۱۰	صاحب علم کب صاحب حال بنتا ہے	۹۸	کی سعیت نے صحابہ کو کیا سے کیا بنا دیا
۱۱۱	طریقت کیوں ضروری ہے	۹۸	کامل کی سعیت سب کچھ بدل دیتی ہے
۱۱۱	اس لطیف فن میں کامیاب کون ہو سکتا ہے	۹۹	سعیت میں تربیت کا طریقہ
۱۱۲	ایک بے جان خطرہ	۹۹	خانقاہیت کی حقیقت
۱۱۲	متنازع مسائل کی حقیقت	۱۰۰	جو ہو رہا ہے سب کچھ مصلحت ہے
۱۱۳	شریعت کی حدود واضح ہیں	۱۰۱	مصاحبت سے بڑھ کر اور کچھ نہیں
۱۱۳	مجازیب شریعت کا ادب کرتے ہیں	۱۰۱	بنا خدا بودن کی اصل حقیقت
۱۱۴	الراسخون فی العلم کون ہیں	۱۰۲	سعیت کے آثار موجود ہوتے ہیں
۱۱۵	تدبر فی القرآن سے اہل شریعت اور	۱۰۳	اسباق تربیت کی غرض و غایت
۱۱۵	اہل طریقت کا اختلاف منٹ سکتا ہے	۱۰۴	اصل دین کیا ہے
۱۱۶	فنیج سعیت	۱۰۴	توحید شریعی سے توحید تکوینی کی
۱۱۶	جب نبھاؤ نہ ہو سکا تو نتیجہ ظاہر ہے	۱۰۴	جانب سفر
۱۱۷	بد عقیدہ مرید کا انجام	۱۰۵	یہ خواص کا منصب عوام کا نہیں
۱۱۷	تربیت کامل سے غیر اللہ کی محبت	۱۰۵	ولایت کی حقیقت
۱۱۷	دل سے کل جاتی ہے	۱۰۵	طبعی مناسبت
۱۱۸	جب استعداد ہی نہ ہو تو پیر کیا کرے	۱۰۶	ظاہر و باطن ایک ساتھ نہیں چل سکتے
۱۱۹	تصوف کیا ہے	۱۰۶	ایک ضرور غالب رہے گا

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۵۰	محبت الہیہ کیوں ضروری ہے؟	۱۲۱	حصہ دوم
۱۶۲	اختلافِ تعدد	۱۲۳	رشد
۱۶۴	ہدایات	۱۲۴	اصحاب کف کی مختصر کہانی
۱۶۸	قصہ کی آخری کڑی	۱۲۶	الکف والقیم
۱۷۰	مدت کی تعیین	۱۲۸	ایک جامع دعا
۱۷۲	آخری ہدایت اور ارشاد	۱۲۹	گوش بندگی کی حکمت
۱۹۲	صوفی کو کسی جگہ سے نہیں پڑنا چاہیے	۱۳۰	قصہ کے اجمال اور اختصار کی وجہ
۱۹۵	زندگی کے دو نظریے	۱۳۱	خانقاہیت
۱۹۹	ذکر کے فوائد	۱۳۳	رحمتِ خاصہ کیا ہے؟
۲۰۰	ذکرِ کثیر	۱۳۴	ولایت
۲۰۱	ابتدائی اور آخری ذکر	۱۳۵	جوشِ ایمانی
۲۰۳	ہوی	۱۳۶	الکف کا نقشہ
۲۰۴	تصوف سے دنیا آباد ہوتی ہے	۱۳۹	سب اصحاب کف

حقائقِ الہامیہ کو حال کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ آپ بار بار

پڑھیں تاکہ حقائق کی تاثرات سے فائدہ اٹھایا جاسکے

تصوف اسلامی کی ایک جھلک

یعنی

طریقت کی حقیقت

یہ حکیم کی روشنی میں



عبد کتب عالم

یکے از مطبوعات ادارہ تصوف لاہور

پتہ: نظام بلڈنگ موہنی روڈ لاہور

ادارہ تصوف

مادی دنیا روحی دنیا سے اگرچہ بہت کچھ دور ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے تاہم سکون اور اطمینان قلبی کی جستجو میں پریشان ہے اور بہت سی الجھنیں علمی طور پر اس راہ میں پیدا کر دی گئی ہیں تصوف و فقر سرسکون ہے۔ اور ہر پریشان حال کو سکون کی دعوت دیتا ہے اس لیے عام طور پر پیشین اہل تصوف اور تصوف کی پیاس رکھتی ہیں۔ لیکن موجودہ وقت میں کوئی ٹھوس علمی رسالہ تصوف پر پیش نہیں کیا جا رہا اس صورت پریشان حالی کو دیکھتے ہوئے چند احباب نے یہ ادارہ قائم کر دیا ہے۔ تاکہ اس سے بنیادی اور بلند پایہ مضامین اور مقالات شائع کر کے دعوتِ فکر کا سامان مہیا کیا جاوے۔ ادارہ کو وسعت دینے کے لئے اہل فکر و نظر کو دعوت دی جاتی ہے۔ کہ وہ ادارہ کے ارکان میں داخل ہو کر ہماری امداد کریں۔ مستقل ارکان کے نام کار جسٹریٹ ہونا لازمی ہے۔ تاکہ شائع کردہ مقالات کی اطلاع دی جائے۔ چند ممبری حسبِ طبیعت ہے۔

منجانب مہتمم ادارہ تصوف نظام بلڈنگ موہنی روڈ لاہور



پیش لفظ

رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۝ وَكَيِّرْ لِي اَمْرِي ۝ وَاحْلِلْ
عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي ۝ يَفْقَهُوا قَوْلِي ۝

جملہ سے سنتے آئے ہیں کہ میاں! بشرحیت کو طریقت یعنی علم معرفت سے کیا تعلق! لیکن یہ دیکھ کر اور غیرت ہوئی۔ کہ علمی دنیا بھی اب یہ کہنے لگی ہے کہ تصوف و طریقت کا نشان کتاب و سنت میں نہیں ملتا۔ آخر تصوف اور طریقت کیا ہے! یہی الہی معرفت ہی نہیں؟ پھر کیا قرآن حکیم معرفت الہیہ سے خالی ہے؟ اور قرآن حکیم صرف اخلاق، قوانین اور سیاست ہی ہے اور بس؟ اگر ایسے ہے تو پھر ان اخلاق و قوانین و سیاست کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے کیا تعلق!

یہ کارخانہ کائنات کو اپنی سائنس سائنسی کے لئے تیار کیا اور پیغمبر اپنی معرفت
لہ عاشق علیہ السلام پر

کے لئے رہنما بنائے اور اسی رہنمائی کے لئے قرآن حکیم کا نزول ہوا لیکن یہ سب کچھ حق ہونے کے باوجود یہ کہا جائے کہ کتاب و سنت میں معرفت کا نشان نہیں تو کونسا عقلمند ہے جو یہ باور کرے۔

اصل میں ریڈیو، اسٹیشن، سینکڑوں ہیں لیکن اپنا ریڈیو وہی آواز پکڑتا ہے جس کے لئے ہمیں خواہش ہو اور اس سے دل بستگی ہو۔

بعینہر ہی حال ہے کتاب و سنت کا جسے جس چیز کی طلب ہے وہ اس سے چھانٹ لیتا ہے۔ اور دوسرے علوم و معارف کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ آج کل سیاست کی طرف توجہ زیادہ ہے اور اسی پر علمی طبائع قرآن حکیم کی تفسیر میں لگی ہوئی ہیں۔ ایک عام امر جس کو سیاست سے کسی قسم کا تعلق نہیں اس کو بھی کھینچ تان کر اپنے سیاسی نظریہ کے ماتحت لایا جاتا ہے ورنہ قرآن حکیم تو سراسر معرفت ہے اور معرفت کے لئے نازل ہوا۔ تاکہ اللہ کے بندے اپنے مولا اور اپنے رب کی شناخت کریں۔ اور اس کی عبادت اور اطاعت سے بہرہ ور ہو کر فلاح دارین پر کامیاب ہوں۔ اگرچہ بعض جزوی مسائل معاشی اور معاشرتی بھی اس کے اندر حسب موقع جھلکتے ہیں لیکن اصل مقصود تو معرفت الہیہ ہی ہے اور غالباً کسی کو اس سے انکار نہیں ہوگا۔

ہر دانشور جانتا ہے۔ کہ عمل کی بنیاد علم ہے یعنی ہر عمل کا بیج (تخم) علم ہے۔

سلاہ گذشتہ صفحے کا عاشریہ جو لوگ بیٹ کو بھی اصل مقصد کا ثبات خیال کرتے ہیں۔ اگر ایسے ہی ہے تو پھر اس کا رزاقانہ قدرت کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت اور خدا تعالیٰ کو تسلیم کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ ایسی صورت میں الحاد ہو گا دین نہ ہوگا۔

اس لئے جہت تک معرفت نامہ نصیب نہ ہو احکام الہی کی تعمیل کے لئے تیاری نہیں ہو سکتی۔ خواص (انبیاء علیہم السلام) کو پہلے معرفت دی جاتی ہے اور معرفت شناسائی ذات کے بعد احکام الہی سے سرفرازی بخشی جاتی ہے اور الہامی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے لیکن عوام امت کو یقین انبیا (خواص) کے ذریعہ پہنچ جاتا ہے۔ اور وہ خواص کے پیرو ہو جاتے ہیں۔ اس لئے عوام کو پہلے عمل کی دعوت ہوتی ہے اور پھر عمل۔ ان کو علم کی طرف لے جاتا ہے۔ اور عمل کا نوا تر معرفت کی تمام راہیں کھول دیتا ہے۔

معرفت کا پہلا زینہ شریعتِ حقہ ہے۔ اور دوسرا زینہ طریقتِ حقہ ہے۔ شریعت پر پابند ہونے سے گاہے خود دوسرے زینہ پر قدم اٹھ جاتا ہے اگر استعداد کامل ہو۔ ورنہ دوسرے زینہ کے لئے کچھ رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے پہلے زینہ کے لئے علمائے کرام کی خدمت میں حاضری ضروری ہے۔ اور دوسرے زینہ کے لئے صلحائے کرام و اہل دل اللہ والوں کی خدمت میں حاضر ہونے سے شرفِ سعادت حاصل ہوتا ہے۔ علمائے شریعت کا یہ کہنا کہ شریعت کے سوا طریقت کچھ نہیں ہے شک ایسے ہی ہے۔ دوسری جماعت کی بنیاد جماعت اول ہے لیکن شریعت کی تکمیل اور شریعتِ حقہ کے اندر جان ڈالنے کے لئے طریقت روح کا کام دیتی ہے۔

لَا الَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۗ اِنَّهُمْ لَمِنَ لَدُنَّا لَوَاقِعٌ
 نے ہمارے لئے مجاہدے کئے ہم ان پر اپنے راستے کھول دیتے ہیں۔

کسے معلوم نہیں کہ توحید کے دو پہلو ہیں، ایک پہلو تشریحی ہے اور دوسرا
 تکوینی۔ تکوینی توحید پر کائنات کی تخلیق ہے۔ اور تخلیق کے بعد کائنات کے چلن کا مدار
 تشریحی توحید پر ہے لیکن خود سوچئے جان کے ہوا جسم کیسے فعال ہو سکتا ہے۔ اسلئے
 تمام قرآن حکیم تکوین و تشریح سے بھرا ہوا ہے۔ اور یہ جیل اللہ والہی رتی تکوین و تشریح کی
 تاروں سے گوندھی گئی ہے جس کی آمیزش معجون سی ہوگی۔ اور کسی ایک جزو کا دوسرے
 سے علیحدہ کرنا ناممکن ہے۔ اگر کوئی نابکار ایسے کر بھی لے تو اسلام کی رتی کھل جانے
 سے بیکار ہو جائے گی اور اپنی منصبی کھو بیٹھے گی۔

یہ چند صفحے طریقت کی حقیقت پر پیش کئے جاتے ہیں صرف نمونہ درنہ قرآن
 حکیم کا ایک ایک ورق، ایک ایک صفحہ اور ایک ایک سطر اسی معرفت الہی کی رہنمائی
 سے بھر پور ہے۔ صرف وضاحت کے لئے کچھ عرض کر دیا گیا۔ تاکہ ظاہر میں اپنے دل
 کی بصارت سے یہ اشارات پا کر مطمئن ہو جاویں اور ناسخ و حجبہ تصوف پر نہ لگاویں کہ یہ
 کتاب و سنت سے باہر ہے درنہ ہوشیار کے لئے تو سعدیؒ کا ایک شعر ہی
 کافی ہے

برگِ درختانِ سبز در نظر ہوشیار

ہر ورقِ دفتر است نہ معرفتِ کردگار

ذرا ہوشیار ہو کر اور فرقہ و مسلک سے بلند ہو کر یہ اوراق مکرر نہ کر رہے ہیں
 تو انشاء اللہ وہ کچھ حاصل ہو گا جس کی آپ کو فطرتاً پیمائش ہے۔ قرآنی حقائق کا حصہ
 اول و دوم "قرآنی نظریہ حیات" اور خانقاہی تصوف کا پورا خاکہ صحیفہ قرآنی میں غالباً
 آپ پڑھ چکے ہوں گے یہ حصہ طریقت کی حقیقت اسی مقالہ کا تیسرا حصہ ہے۔

ضروری ہے کہ پس منظر دوبارہ مطالعہ کر لیں۔

اس حصہ میں صرف سورہ الکہف کی پہلی آیات اور آخری حصہ سے مراد ہے اور
 حضرت کی بابت آیات کی تفسیری وضاحت کی گئی ہے۔ امید ہے کہ آپ فرق و مسلک
 سے بلند ہو کر اس حصہ کے اوراق کا مطالعہ فرما دیں گے اور بعض امور کو نیا پائیں گے۔ جو
 پہلے مفسرین کی توضیحات میں نہیں مل سکے۔ ہاں بعض آخری دور کے مفسرین مثلاً مولانا آزاد
 وغیرہ کے تفسیری نوٹوں میں بعض اشارے پائے جاتے ہیں لیکن یہ سلسل جو ہماری
 تفسیری وضاحت میں آپ پائیں گے کہیں اور نہیں پائیں گے تفسیر قدیم ہو یا جدید۔
 زیادہ وجہ تو یہ ہے کہ علمائے کرام کو فقر و تصوف کے ساتھ کلی مناسبت نہیں۔
 اور وہ زیادہ تر علمی تحقیقات میں کھوٹے جاتے ہیں اور اصل مدعا پر توجہ نہیں دے سکتے۔
 اہل تصوف جو تفسیری مقامات تصوف کی بہترین تشریح و توضیح کر سکتے ہیں
 وہ اپنے خیال میں سمرست، علم کی طرف توجہ نہیں دیتے اور مقامات تصوف و معرفت
 سے علمائے ظاہر چپکے سے نکل جاتے ہیں اور کسی خاص چیز کو ایسے مقامات سے
 پیدا کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے مثلاً اصحاب کہف اور حضرت موسیٰ کے قصہ
 میں کچھ ایسے نتائج اور حقائق واضح نہیں کئے گئے جو دوسرے مقامات پر نظر آتے
 ہیں اور جن کے بیان کی بہت بڑی ضرورت تھی۔

اصحاب کہف میں تو سلسلہ سیاق و سباق کو مد نظر نہ رکھتے ہوئے اور
 الکہف کا صحیح ترجمہ اور تخیل سامنے نہ لاتے ہوئے جو کچھ لکھا گیا وہ تمام بے جوڑ اور بے مقصد
 نظر آتا ہے اور اصل مسئلہ پہلے سے بھی پیچیدہ ہو گیا۔ امید ہے کہ میری گستاخی
 معاف کرتے ہوئے اصل حقیقت کو دیکھنے میں کوشاں ہو کر ہمارے ذوق تفسیری

سے خوش ہوں گے اور اپنے اختلاف رائے سے مطیع فرما کر مشکور فرماویں گے

آدمی از سہو و خطا پاک نیست

آبِ رواں جز جس و عاشاک نیست

خیر اندیش شریعت و طریقت

محمد عسمر کان اللہ اعلم بیروتی

مقام کھوڑہ ۲۷ جولائی ۱۹۶۱ء

نوٹ: برادرانِ طریقت کا فرض ہے کہ برادرانِ غیر طریقت تک یہ

چند اوراق پہنچادیں اور ثواب دایین حاصل کریں۔



مذہب سراسر اطمینان سے کیونکہ
اس کا مقصد معین اور اس کے وسائل
اور راستے واضح اور روشن اور مرنے
کے بعد ایک درخشاں زندگی کا تصور
پیش کرتا ہے۔



ادارہ تصوف بلند پایہ معیار پر قائم ہے۔ اور رسمی
قیود سے آزاد۔ اس کی مطبوعات تکمیل دل پیدا
کرتی ہیں۔ اور فطرت انسانی کی پیاس بجھاتی ہیں۔
آپ بھی اس کی مطبوعات پر ایک نظر ڈالیں۔
مندرجہ ذیل کتابیں چھپ چکی ہیں۔

قرآنی نظریہ حیات	قیمت	۸
الہامی	"	۴
طریقہ کی حقیقت (قرآنی آیات میں)	"	۴
نوٹ :- "بینوں کتب اکٹھی خریدنے والے کو مجلد صرف دو روپے میں دی جائیں گی۔		

(گلزار عالم پریس لاہور)

پس منظر

بعض دینی تحریکوں کو کامیاب بنانے کے لئے اعتراض اور شبہات کے جو وار اقدار تصوف پر کئے گئے ان سے متاثر ہو کر یہ چہنہ اور اوراق خدمت دین تصور کرتے ہوئے لکھے گئے ہیں۔

امید ہے کہ ان اوراق کے پڑھنے سے خود بخود وہ شکوک و شبہات رفع ہو جائیں گے جو بعض علمی حلقوں کی طرف سے اقدار تصوف پر کئے گئے اور یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ تصوف اسلام کے حال و حال کے مجموعے کا نام ہے اور تصوف روح اسلام ہے اور اس کی بنیاد کتاب و سنت کے سوا کچھ نہیں اور کہ اس کی زندگی اسلام کی زندگی ہے اور اس کی موت اسلام کی موت۔ کیونکہ کوئی جسم بلا جان زندہ نہیں رہ سکتا۔

توحید و رسالت جو اصل سرمایہ دین ہے اس کی تکمیل ہی اولین مقصد تصوف ہے اور بس حقیقی صوفی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا عکس ہوتا ہے اور رسالت کی نیابت کے تمام فرائض ادا کرتا ہے۔ اس مقالے کے پانچ حصے ہیں۔

- (۱) قرآنی نظریہ حیات۔ (۲) خانقاہی تصوف کا پورا خاکہ صحیفہ قرآنی میں۔
- (۳) طریقت کی حقیقت قرآنی آیات میں (۴) درس تصوف کا ایک عملی سبق سورہ مزمل میں۔
- (۵) قرآن اور تصوف۔

”دنیا نانی“ تصوف کا پہلا عقیدہ توحید کے بعد ہے جس پر تصوف کا مدار

حقیقی ہے اور ہر مذہب کے اندر موجود ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے بھی اس عقیدہ یا نظریہ کو کئی بار مختلف طریقوں سے جاگتی دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

لیکن آج اس نظریہ کو پیش کرنے کی جرأت کسی کو نہیں کیونکہ مادی دنیا کا غلبہ اتنا ہو گیا کہ روحانیت کا کوئی نظریہ پیش کرنا ساری سوتی دنیا سے مقابلہ کرنا ہے جو کسی کی ہمت نہیں اس لئے ہم نے سب سے پہلے پیش کرنے کی جرأت کی۔

اس سے پہلے خانتقاہی تصوف پر بڑے کچھ لکھا گیا ہے اور جو کچھ لکھا جا رہا ہے۔

دہ علم دوست حضرات سے پوشیدہ نہیں۔ ۶

فکر برکس بقصد ہمت دست

اور تصوف کے اقدار کو خصوصاً خلوت پسندانہ طریقہ کو نہایت ناموزوں الفاظ سے دہرایا جاتا ہے۔ تاکہ دلوں میں نفرت پیدا ہو اور تصوف کو اسلام سے بیگانہ خیال کیا جائے۔ امید ہے کہ آپ ہر نظریہ کا پوری توجہ سے مطالعہ فرمائیں گے اور پورے غور

سے فیصلہ دیں گے کہ تصوف کی جان اسلام ہے یا کچھ اور

اولے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سمر

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَاِذْ قَالَ مُوسٰى لِفَتٰىهِ لِآبْرٰحَ
 حَتّٰى اَبْلُغَ مَجْمَعِ الْبَحْرِیْنِ
 اَوْ اَمْضِیْ حَقْبًا ۝ فَلَمَّا بَلَغَا
 مَجْمَعَ بَیْنَهُمَا نَسِیَا حُوتَهُمَا
 فَاتَّخَذَ سَبِیْلَهُ فِی الْبَحْرِ سَرَبًا ۝
 فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهِ اَتِنَا
 عِلًّا نَا زَلَقَدْ لَقِیْنَا مِنْ سَفَرِنَا
 هٰذَا نَصَبًا ۝ قَالَ اَرَعِیْتَ اِذْ
 اَوْتِنَا اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنّیْ نَسِیْتُ
 الْحُوتَ وَمَا اَنْسٰنِیْهِ اِلَّا الشَّیْطٰنُ
 اَنْ اذْکُرَهُ ۝ وَاتَّخَذَ سَبِیْلَهُ
 فِی الْبَحْرِ حَجْبًا ۝ قَالَ ذٰلِكَ
 مَا كُنَّا نَبِغُ فَاَرْسَدَا عَلٰی
 اَشَارِهِمَا قَصَصًا ۝ فَوَجَدَا
 عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا اٰتِیْنَاهُ
 رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنَاهُ

اور جب کہا موسیٰ نے واسطے جو ان اپنے
 کے کہ نہ ٹیلوں گا میں یہاں تک کہ پہنچوں
 میں جگہ ملنے دو دریا کے۔ یا چلا جاؤں
 برسوں تک پس جب پہنچے دونوں جگہ ملنے
 کے درمیان ان دونوں کے بھول گئے مچھلی
 اپنی پس بکڑی اس نے راہ اپنی دریا میں
 خشک پس جب گذر گئے اس سے کہا واسطے
 جو ان اپنے کے سے ہم کو کھانا ہمارا صبح کا البتہ
 تحقیق ملے ہم اس سفر اپنے سے رنج کو کہا کیا
 دیکھا تم نے جب جگہ بکڑی تھی تھے طرف پتھر کی پس میں
 بھول گیا مچھلی اور نہ بھلا دی مجھ کو وہ مچھلی مگر
 شیطان نے یہ کہ ذکر کروں اس کا اور بکڑی اس نے
 راہ اپنی بیچ دریا کے عجب۔ کہا یہی ہے جو کچھ
 تھے ہم چاہتے پس پھرائے دونوں پر نشانوں
 پاؤں اپنے کے نقش دیکھتے پس پایا ایک نشے
 کو بندوں ہمارے سے کہ وہی تھی ہم نے

مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا ۝ قَالَ

لَهُ مُوسَىٰ هَلْ أَتَيْتُكَ

عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَنِي مِمَّا

عَلَّمْتَ رُشْدًا ۝ قَالَ

إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ

صَبْرًا ۝ وَكَيْفَ تَصْبِرُ

عَلَىٰ مَا لَمْ يَحِطْ بِهِ

خُبْرًا ۝ قَالَ سَتَجِدُنِي

إِنْ شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي

لَكَ أَمْرًا ۝ قَالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي

فَلَا تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ

أُحَدِّثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ۝

فَانْطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا رَكِبَا

فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا ۝ قَالَ

أَخْرَقْتُهَا لِتُفْرِقَ أَهْلَهَا ۝

لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا ۝

قَالَ أَلَمْ أَقُلْ إِنَّكَ

لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝

قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا

رحمت نزدیک اپنے سے اور سکھایا تھا ہم

نے اس کو اپنے پاس سے علم۔ کہا واسطے اس

کے موسیٰ نے کیا پیروی کروں میں تیری

اور پاس کے کہ سکھائے تو مجھ کو اس چیز سے

کہ سکھایا گیا ہے تو بھلائی۔ کہا تحقیق تو ہرگز

نہ کر سکے گا ساتھ میرے صبر۔ اور کیونکر صبر

کرے گا تو اور پاس چیز کے کہ نہیں گھیرا تو نے

اس کو سمجھ سے۔ کہا البتہ پابگیا تو مجھ کو اگر

چاہا اللہ نے صبر کرنے والا اور نہ نافرمانی

کرونگا میں واسطے تیرے کسی حکم کی۔ کہا پس

اگر پیروی کرے تو میری پس مت سوال کیجیو مجھ

سے کسی چیز سے یہاں تک شروع کروں میں واسطے

تیرے اس کا کہ پس چلے دونوں یہاں تک

سوار ہوئے بیچ کشتی کے۔ پھاڑا اس کو۔ کہا

کیا پھاڑا تو نے اس کو تاکہ ڈبا دیوے لوگوں

اسکے کو۔ البتہ تحقیق لایا تو ایک چیز بھاری۔

کہا۔ کہ کیا نہ کہا تھا میں نے یہ کہ تو ہرگز

نہ کر سکے گا ساتھ میرے صبر۔

کہا مت پکڑ مجھ کو ساتھ اس چیز کے

نَبِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِي مِنْ
 أَمْرِي عُسْرًا ۝ فَانْطَلَقَا
 حَتَّى إِذَا لَقِيَا غُلَامًا
 فَقَتَلَهُ قَالَ أَقْتَلْتَنِي
 نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ
 نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا
 نُكْرًا ۝ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ
 لَكَ إِنِّي لَنْ أَسْتَطِيعَ
 مَعِيَ صَبْرًا ۝ قَالَ إِنْ
 سَأَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ
 بَعْدَهَا فَلَا تُصَحِّبْنِي
 قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَدُنِّي عُذْرًا ۝
 فَانْطَلَقَا فَحَتَّى إِذَا أَتَيَا
 أَهْلَ قَرْيَةٍ اسْتَطْعَمَا
 أَهْلُهَا فَأَبَوْا أَنْ يُضَيِّفُوهُمَا
 فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا
 يُرِيدُ أَنْ يَنْقُضَ فَأَقَامَهُ
 قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ
 عَلَيْهِ أَجْرًا ۝ قَالَ هَذَا

کہ بھول گیا میں اور مت ڈال اور میرے
 کام میرے کئے تنگی یعنی دشواری پس چلے
 دونوں یہاں تک کہ جب ملے ایک لڑکے
 کو پس مار ڈالا اس کو۔ کہا کیا مار ڈالا تو نے
 جان پاک کو بغیر بدلے جان
 کے۔ البتہ تحقیق لایا تو چسپنہ
 بری۔ کہا کیا نہ کہا تھا میں نے تجھ کو
 تحقیق تو ہرگز نہ کر سکے گا ساتھ میرے
 صبر۔ کہا اگر سوال کروں میں تجھ سے
 کوئی چیز پیچھے اس کے پس مت
 صحبت میں رکھو مجھ کو تحقیق پہنچا تو
 میرے پاس عذر کو۔ پھر چلے
 دونوں یہاں تک کہ جب آئے
 لوگوں کے پاس ایک گاؤں کے۔
 کھانا مانگا لوگوں اس کے سے پس
 انکار کیا انہوں نے یہ کہ ضیافت کریں
 انکی پس پائی دونوں نے بیچ اسکے ایک دیوار۔
 چاہتی تھی یہ کہ ٹوٹ جاوے پس یہاں کھڑا
 کر دیا اس کو کہا اگر چاہتا تو البتہ لیتا او۔

فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ
 سَأُنَيْتُكَ بِتَأْوِيلِ مَالِكٍ
 تَسْتَطِيعُ عَلَيْهِ صَبْرًا ۝
 أَمَا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ
 لِمَسْكِينٍ يَعْمَلُونَ فِي
 الْبَحْرِ فَأَرَدْتُ أَنْ أَعِيبَهَا
 وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ
 يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ
 غَصْبًا ۝ وَأَمَا الْغُلَامُ
 فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنِينَ فَخَشِينَا
 أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا
 وَكُفْرًا ۝ فَأَرَدْنَا أَنْ يُبْدِلَهُمَا
 رَبُّهُمَا خَيْرًا مِمَّنْهُ زَكَاةً
 وَأَقْرَبَ رُحْمًا ۝ وَأَمَا
 الْجُدَارُ فَكَانَ لِفُلْمَيْنِ
 يَتِيمَيْنِ فِي الْبَدِينَةِ وَ
 كَانَ تَحْتَهُ كَنْزُهُمَا وَ
 كَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ
 رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا

اسکے مزدوری۔ کہا یہ جدائی ہے درمیان
 میرے اور تیرے۔ اب خبر دوں گا میں تجھ
 کو ساتھ حقیقت اس چیز کے کہ نہ کر سکا تو اس
 پر عبرت اسی پرستی پس تھی واسطے فقیروں کے
 محنت کرتے تھے بیچ دریا کے۔ پس
 ارادہ کیا میں نے یہ کہ عیب ڈال دوں اس
 میں اور تمہا پرے ان کے ایک بادشاہ
 لے لیتا تھا ہر کشتی کو چھین کر۔ اور اسی پر
 لڑکا پس تھے ماں باپ اس کے
 ایمان والے۔ پس ڈرے ہم یہ کہ گرفتار
 کرے ان کو سرکشی اور کفر میں۔ پس ارادہ
 کیا ہم نے یہ کہ بدلا دیوے ان کو رب ان
 کا بہتر اس سے پاکیزگی میں اور نزدیک
 مہربانی میں۔ اور اسی پر دیوار۔ پس تھی
 واسطے دو لڑکوں یتیم کے بیچ شہر کے۔
 اور تھا نیچے اس کے گنج واسطے ان
 دونوں کے۔ اور تھا باپ ان دونوں
 کا نیک سخت۔ پس ارادہ کیا
 رب تیرے نے یہ کہ پہنچیں جوانی اپنی کو

وَيَسْتَخْرِجًا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً ۖ
 مِّنْ رَبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهُ
 عَنُ امْرِي ۖ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ
 مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ۝
 کی کہ نہ کر سکا تو او پر اس کے صبر۔
 آیات بالابندرہ پارہ کے آخری دو رکوع اور سورہ کہف کے رکوع ۵
 ۷ کی کل ۲۳ آیات ہیں۔ پہلے ان کو غور سے پڑھیں۔ پھر ترجمہ کو توجہ سے
 دہنیں بار پڑھ کر اسے ذہن نشین فرمائیں۔

سورہ کہف

اس کے اندر تین تمثیلی قصے ہیں۔ ایک اصحاب کہف کا۔ دوسرا حضرت کا۔
 تیسرا ذوالقرنین کا۔ تینوں میں وجہ مشارکت یہ ہے۔ کہ تین قصوں کی شخصیتیں
 غیر نبی ہیں۔ نبی نہیں لیکن اس وجہ کے ہیں۔ کہ ان کو تمثیلاً قرآن حکیم میں
 پیش کیا گیا۔

امثالی تعلیم

قرآن حکیم میں تمثالی تعلیم و تربیت کے نمونے عام ہیں۔ اور مولیٰ کریم اس
 طریقے سے بہت بڑے بڑے اہم مطالب عام فہم کرنے کے لئے مثالی طور
 پر واضح فرماتے ہیں۔ اس میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ہر عقل کے لئے
 اس میں موقع ہے۔ فہم اور عقل آدمی اس سے بہت بڑے مطالب اخذ
 کرتے ہیں اور کم درجہ والے اپنی اپنی عقل کے مطابق بصیرت حاصل کرتے ہیں۔

وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ ط

اس حقیقت کو قرآن حکیم کی جگہ موقع بموقع بیان فرماتا ہے۔ اس پارہ پندرہ میں تین جگہ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ط (کہ ہم نے قرآن میں ہر طرح کی مثالیں آدمیوں کے لئے بیان کیں) فرمایا لیکن وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ه کہ انسان بہت زیادہ جھگڑالو ہے۔ اور مَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا نُفُورًا۔ (مگر ان سے فائدہ پہنچنے کے بجائے نفرت بڑھتی گئی۔ ان آیات بالا سے) ماقبل یہی الفاظ دہرائے گئے لیکن جن لوگوں کے لئے ہدایت کے سرچشمے کھول دیئے گئے۔ وہ ان امثلہ سے کمال مطالب اخذ کرتے ہیں۔

قصۃ خضر

قصۃ خضر بھی اسی لئے پیش کیا گیا۔ کہ مولیٰ کریم اس کے ذریعہ بہت سے اہم مطالب کی اُمت محمدیہ کو تعلیم و تربیت دینا چاہتے تھے۔ خالی قصہ نہیں۔ کہ ایک قصہ کا علم ہو جائے۔ بلکہ سراسر ہدایت و رشد کی تعلیم ہے۔

موسیٰ

یہ وہی موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ جو بنی اسرائیل کے اولوالعزم نبی اور رسول اور صاحبِ مہجراتِ ظاہرہ اور فرعون کی مملکت کو تباہ کرنے والے اور اس کے خدائی دعویٰ کی بے بنیاد حقیقت کو روشن کرنے والے تھے۔ جن کے

قدیعیہ بنی اسرائیل کے لاکھوں افراد نے قبطیوں کے ظلم سے نجات پائی۔ اور صرف نجات ہی نہیں بلکہ غلامی سے نجات تک۔ تاکہ تجھے و تاج کا بنی اسرائیل کو مالک بنا دیا۔ اور دین و دنیا کی عظمت والی تہذیب کو باقی رکھیں۔ بلکہ یہی علیہ السلام کی بزرگی و عظمت کی دلیل ہے۔
کھلی لاریوں میں لالہ ہیں۔

مختصری تعلیم کی کیوں ضرورت پیش آتی

روایات میں آیا ہے۔ کہ آپ ایک دن وعظ فرما رہے تھے۔ کہ ایک آدمی تھکے ہوئے آیا۔ کہ آپ سے کوئی زیادہ بھی علم رکھتا ہے۔ تو جواباً کہا کہ میں نہیں جانتا۔ چونکہ اس جواب سے تکبر کی بو آتی تھی۔ جو اللہ تعالیٰ کو اپنے خاص بندوں سے کسی صورت پسند نہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے حضرت خضرؑ کو پیش کیا۔ تاکہ وہ دیکھ لیں کہ ان کا علم ان کے مقابلہ میں کیسا ہے۔ لیکن ایسا ہو بھی سکتا ہے ہم ہماری سمجھ اس سے جدا کئی ہے۔ کہ یہ روایات ہیں جو ضرورت پر اکثر پیش کی جاتی ہیں۔

اصل حقیقت

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت تشریحی تھی۔ یہ کوئی نہیں تھی۔ اور جب تک بنی اسرائیل کو خلاصی دینے کی ضرورت تھی۔ اس وقت تک تو شریعت اور ظاہر ہوئی۔ بلکہ یہی علیہ السلام کو رکھنا ضروری تھا۔ لیکن جب یہ کام ہو گیا تو اس کے بعد علم کی تعریف دینی ضروری تھی۔ تاکہ یہ اولو العزم ہی اپنے استہمالی

کلمات کو پہنچے۔

ہمیشہ سے ایسا چلا آتا ہے۔ کہ ہر صاحب ہدایت کو پہلے علم ظاہری سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ اور جب وہ مکمل ہو جاتا ہے۔ تو پھر دوسرا قدم اٹھانے کے لئے اس کا راستہ کھول دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ اسرار الہیہ کا مخزن ہو کر خدائے حکیم کی حکمتوں اور تدبیروں و تقدیروں سے واقف ہو کر بارگاہ الہیہ سے کسی وقت بھی سر نہ اٹھائے۔ اور ہر آن عبودیت کی جلوہ آرائیوں سے روشن ہوتا رہے۔

حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ط (یہاں تک کہ موت آجاوے) کیونکہ پہلا کام جب ختم ہو جاتا ہے۔ تو پھر دوسرے کام یعنی باطن کی آبیاری شروع ہو جاتی ہے۔

تفصیل

اس خاکہ کو واضح کرنے کے لئے تکوین و تشریح کے معرکہ کو حل کرنا ضروری ہے۔ ایک قانون الہیہ تکوینی ہے۔ دوسرا قانون الہیہ تشریحی۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ط (انعام)

اس نے آسمان و زمین پیدا کئے۔ اور اندھیرا اور روشنی بنائی۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كٰفِرٌ وَمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ط (تغابن)

اس نے تمہیں پیدا کیا۔ بعض تم سے کافر ہیں اور بعض مسلمان ہیں۔ اور ایسی بہت سی آیات ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نیک و بد کا پیدا کرنے والا ہے۔ نور، اندھیرا۔ دونوں کا خالق وہی ہے۔ شر و خیر اسی کے ہاتھ میں ہے۔ فرماتے ہیں۔

اِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوْا هٰذِهِ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ط وَ

لَنْ تُصِيبَهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هَذِهِ مِنْ عِنْدِكَ طَقُلْ كُلٌّ
 مِنْ عِنْدِ اللَّهِ۔ نیکی انہیں پہنچتی ہے۔ تو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے
 اور کوئی بڑائی پہنچتی ہے۔ تو کہتے ہیں کہ تیری وجہ سے ہے۔ آپ انہیں
 کہہ دیجئے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

غرض تکوین میں نیکی خود نیکی ہے لیکن بدی بھی تکوین میں نیکی ہے۔ کیونکہ
 خود خالق سر اسر نیکی ہے۔ اور صرف نیکی کی پیدائش اس سے ظہور کرے گی
 ہمارے آپ کے نزدیک تو نیکی اور بدی کی تمیز اپنی اصناف سے ہے لیکن
 یہ اصناف یہ چھوڑ دیا جاوے۔ تو ساری دنیا اور اس کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے۔
 رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا قَدْ عَلِمْتَ إِنَّ هَذَا جَانٌّ
 کی مثال یوں خیال کیجئے۔ کہ مسجد و محراب اور اس کے ساتھ بیت الخلاء
 (یا خانہ) بیت الطہارت (غسل خانہ) عام ضرورت کے مطابق ایک درجہ
 رکھتے ہیں۔ کیونکہ طہارت خانہ نہ ہو۔ تو مسجد میں داخلہ کیسے ہو لیکن جب عام
 ضرورت کو چھوڑ کر دیکھا جائے۔ تو مسجد و محراب کو پاک اور غسل خانہ اور ٹی کو
 پلید خیال کیا جاتا ہے۔ دنیا میں جو شر ہے۔ وہ بھی حقیقتاً خیر کو پروان چڑھانے
 کے لئے ہے۔ فرماتے ہیں۔ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ
 آيَاتِهِ أَحْسَنُ عَمَلًا ط (کہ موت و حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہیں دیکھا
 جاوے کہ کونسا اچھا عمل گزار ہے) اب اگر شر نہ ہو۔ تو پھر یہ امتحان کیسے
 تو معلوم ہوا کہ شر کی بھی اتنی ہی تکوین میں ضرورت ہے۔ جتنی خیر کی۔ کیونکہ یہ
 صفات متقابلہ سے ہیں۔ اور ایک کے بغیر دوسرے کی تمیز مشکل۔

شیطان البرہم بڑا مردود ہے لیکن اس کے سوا دنیا تمام بے رونق ہے۔
 تمام رونق بازی دنیا کی اسی مردود سے ہے۔ جب ایسا ہے۔ تو اس کو کیوں
 بُرا کہا جاوے۔ گو ہمیں حق ہے کہ اس کو بُرا کہیں۔ کیونکہ ہمیں دھوکے دیتا
 ہے۔ اور رب کریم جیسی ہستی سے ہماری توجہ ہٹاتا ہے۔ لیکن آفراس نے
 بھی تو کستی مساحت عام کے لئے اسے پیدا فرمایا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک سوال کہ شیطان کیوں پیدا کیا گیا
 حضرت سلیمان علیہ السلام نے بارگاہِ الہیہ میں عرض کیا۔ کہ اللہ العالمین!
 ہر چیز کی ضرورت ہے لیکن اس شیطان لعین کی کیا ضرورت تھی۔ مولیٰ کریم نے
 فرمایا۔ کہ اگر اس کی ضرورت نہیں۔ تو ہم اسے تمہاری قید میں دے دیتے ہیں۔
 چنانچہ وہ قید ہو کر آپ کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ حضرت سلیمان زنبیل بنایا
 کرتے تھے۔ اور اس کی فروختگی پر گذران تھی۔ سبحان اللہ کتنے بڑے بلند
 بادشاہ کہ ہوا تخت اڑائے پھرتی ہے۔ لیکن اپنی کمائی سے گذران رکھتے ہیں۔
 لیکن جس دن سے شیطان قید میں آیا۔ کوئی زنبیل فروخت نہ ہوئی۔ آخر تین دن
 گذر گئے۔ فاقہ نے تنگ کیا۔ تو بارگاہِ الہیہ میں عرض کیا۔ کہ آج تیسرے دن
 سے بھوکا ہوں۔ کوئی زنبیل فروخت نہیں ہوئی۔ جواب آیا۔ کہ کیسے فروخت
 ہوں۔ جبکہ فروخت کنندہ تمہاری قید میں ہو۔ کیونکہ دنیا کا تمام کھیل اس سے
 چل رہا ہے۔ اگر یہ نہ ہو۔ تو یہ تمام کارخانہ ختم ہو جاتا ہے۔ حاکم۔ بادشاہ۔ رعایا۔
 راعی۔ نبی سادی وغیرہ وغیرہ امور ات کی اسی وجہ سے ضرور بند ہیں۔ کہ یہ

لذات دنیا میں فلاح کا نام لگایا ہے اور لوگوں کو گمراہ کرنا ہے۔ اور فساد نہ ہو اور
 گمراہی نہ ہو۔ چہرہ و نسبتیاء اور اولیاء کی کیا ضرورت۔ غرض تکوینی صورت
 میں کوئی چیز ہی نہیں۔ ہر چیز نفع سے پر ہے۔ گناہ برا ہے۔ لیکن گناہ کے
 منافع بھی ہیں۔ شراب بڑی ہے لیکن خود سراسر ان حکیم شاہد ہے۔ کہ اس کے اندر
 منافع بھی ہیں لیکن نفع سے ضرر زیادہ ہونے کی وجہ سے ہمارے لئے حرام
 قرار دی گئی۔

تشریح

دنیا کی بیدائش کے لئے تو قانون تکوینی سے کام چلتا ہے لیکن دنیا کے
 نظام کے لئے تشریح کی ضرورت ہے۔ یہاں نیکی بدی کی تمیز ضروری۔ لَا
 يَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا الشَّيْئَةُ ط یعنی نیکی بدی برابر نہیں۔ قُلْ هَلْ
 يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ
 آپ کہہ دیجئے کہ اندھا اور دیکھنے والا برابر۔ یا اندھیرا اور نور برابر نہیں۔ ایک
 دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ وَلَا الظُّلُّ وَلَا الخُرُودُ (سایہ اور گرمی برابر نہیں)
 قوانین نظام میں اگر یہ فرق ہٹا دیا جائے تو تمام انتظام دنیا ایک دن میں تباہ
 ہو جائے گا۔ اور دنیا چل نہیں سکتی۔ اس لئے خود قانون خلقت کے مطابق مولے
 کریم اپنے منشاء قدس کا ظہور فرماتے ہیں لیکن انبیاء علیہم السلام کے احکام
 کے ذریعہ اپنے قانون انتظام کو جاری فرماتے ہیں۔ پہلے علم کو علم باطن سے تعبیر
 کیا گیا ہے۔ ظہور دوسرے کو علم ظاہر یا شریعت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ پہلے
 عالم باطن سے ہوتی ہیں۔ اور دوسرے علم کی حق کے ذریعہ تعلیم

ہوتی ہے۔ پہلے میں واسطہ نہیں۔ اور یہاں واسطہ جن کو پہلے علم باطن دیا جاتا ہے۔ ان کو نبوت سے سرفرازی بخشی نہیں جاتی کیونکہ وہ انتظام ظاہر سے قاصر ہوتے ہیں۔ نبی ظاہری شریعت کو پہلے چلاتا ہے۔ بعد میں حقیقت پر جاتا ہے۔ اگر علم لدنی سے موسیٰ علیہ السلام کو پہلے واقف کرویا جاتا تو فرعون سے ان کی کیسے بھگتی۔ اور کیونکر بنی اسرائیل کو خلاصی دلائی جاتی۔

موسیٰ علیہ السلام کو ہر طور پر جاتے ہیں۔ ہم کلامی خدا کے قدوس سے مشرف ہوتے ہیں۔ اور پھر ظاہری آنکھوں سے دیدار کے طالب ہوتے ہیں لیکن ایک ہی جلوۂ الہی سے بے ہوش گر جاتے ہیں۔ واپس آتے ہیں۔ تو امت کو بچھڑے کی پرستش میں مصروف پاتے ہیں۔ غصے میں آکر الہی تختیاں پھینک دیتے ہیں اور اپنے بھائی ہارون کی دارھی اور سر کے بال پرہ کر گھسیٹتے ہیں۔ اور جب ستر آدمی قربان کراتے ہیں۔ اور بجلی ان پر گرتی ہے۔ تو رملاکہ دیتے ہیں۔ رَبِّ لَوْ شِئْتَ أَهْلَكْتَهُمْ مِنْ قَبْلِ وَإِيَّاكَ أَتَهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الشُّفَهَاءُ مِنَّا ۚ إِنَّ هِيَ إِلَّا فِتْنَتُكَ ۗ اے رب میرے! اگر چاہتا تو ہلاک کرتا ان کو پہلے اور مجھ کو بھی۔ کیا ہلاک کرتا ہے تو ہم کو ساتھ اس چیز کے کہ کیا ہے وقوفوں سے ہم سے۔ ہمیں یہ گرفتہ تیرا۔ یعنی آزمائش تیری۔

خود سوچئے اگر تکوین کے راز کھلے ہوتے۔ تو ایسے بے ادبانه الفاظ کیوں بارگاہِ رب العزت سے کہے جاتے۔ اور قدرتِ ربی کی حکمتیں سامنے ہوتیں۔ تو کیوں اتنے غضب ناک ہوتے۔ اور کیوں بھائی ہارون کی بے عزتی کرتے۔ ان کا کیا قصور تھا۔ وَمَا تَشَاؤُنَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ط تم کچھ نہیں چاہتے۔ مگر جو اللہ تعالیٰ

چاہتا ہے۔ یہ تکوینی الفاظ جس نے سُننے ہوں۔ اور جو اس حقیقت عظمیٰ سے واقف ہو۔
بھلا وہ کیسے اتنی پریشانی ظاہر کرے گا۔ بلے شاہ فرماتے ہیں۔

کی بھروسا اس آشنائی دا

ڈر لگداٹے بے پرواہی دا

(یہ ہے تکوینی حال)

فرعون کی کیا مجال تھی۔ کہ موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا منکر ہوتا۔ اور سرسليم
خم نہ کرتا لیکن موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کیونکر ظاہر ہوتے۔ اور کیونکر بنی اسرائیل کے
ایمان کی تقویت ہوتی۔ جوں جوں اس طرف انکار ہوتا گیا۔ توں توں دوسری طرف سے معجزات
پیش ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ کئی لاکھ بنی اسرائیل کے ایمان پختہ ہو گئے۔ ورنہ کیسے
ممکن تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے فرمان پر وہ گھربار چھوڑاوارہ دشت و صحرا ہوتے۔
اور کیونکر فرعون کی ہلاکت دنیا کے لئے ایک نمونہ بنتی۔ یہ سب تکوینی معاملہ تھا جس
سے ایک تشریح بھوٹ نکلی۔ اور ایک مسئل اپنے پورے نشان و شوکت سے
دنیا میں جا چکا

نسبت عیسوی اور موسوی کا فرق

موسیٰ علیہ السلام فطرتاً تشریحی تھے۔ پیدائش بھی تشریحی تھی۔ اگرچہ پرورش اور
تربیت میں تکوین سے واسطہ پڑا لیکن پھر بھی وہ اس سے متاثر نہ ہونے لگے۔ طبیعت
میں جلال تھا۔ جو موافق مزاج تشریح تھا۔ تکوین سرسریا ہے۔ اور جمال ہے۔
عیسے علیہ السلام کی فطرت اور پیدائش تکوینی تھی یعنی بن باب پید ہوئے۔ بچپن میں

بول اٹھے۔ پرورش جمالی تھی اور تشریحی لیکن اپنی تکوینی نسبت سے وہ پرندے بنا کر اڑاتے رہے۔ اندھوں کو مینا بنانے چلے گئے۔ اور موتی کو زندگی دلائی۔ کسی سے لڑے نہیں جھگڑے نہیں۔ جہاد کے لئے تلوار تو کجا ہاتھ تک نہیں اٹھا۔ بلکہ کسی نے ہاتھ اٹھایا تو اپنا منہ سامنے کر دیا۔ لیکن مومنوں علیہ السلام باوجود ایک بھاری سلطنت بنانے کے دنیا میں اتنے روشن نہ ہوئے۔ جتنا کہ عیسے علیہ السلام۔ یہودی دنیا میں ہمیشہ کی زندگی دولت سے بسر کر رہے ہیں۔ اور عیسائی اس وقت سے لیکر آج تک باعزت سلطنتوں کے مالک چلے آتے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ وہی فرق نسبت تکوینی و تشریحی کا۔ یعنی توحید ذاتی و توحید صفاتی کا۔

قرآنی توحید

قرآنی توحید ایک ممنوعہ (آمینش یافتہ) توحید ہے۔ ایک سر توحید تکوینی میں ہے۔ اور دوسرا سر توحید تشریحی میں۔ خالق کی طرف سے سر توحید تکوینی ہے۔ اور رسالت کی طرف سے سر توحید تشریحی ہے۔ قرآن پاک کا مطالعہ فرمائیے۔ ہر جگہ یہ امتزاج اتنا خوبصورت ملتا ہے۔ کہ ایک کو ایک سے جدا نہیں کیا جاتا۔ وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ طِرَانِ اللَّهُ كَانَ عَلَيْهِمْ حَكِيمًا يُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ ط وَالظَّالِمِينَ أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ط تم وہی چاہتے ہو جو اللہ چاہتا ہے۔ اللہ علم والا اور حکمت والا ہے جسے چاہتا ہے۔ اپنی رحمت میں لے لیتا ہے۔ اور ظالموں کے لئے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے (سورہ دہر کی آخری آیات) غور کریں۔ ایک آیت میں چار ٹکڑے ہیں پہلا اور

تیسرا تکوینی (ذاتی توحید) ہے۔ اور دوسرا اور چوتھا تشریحی یا صفاتی۔

فہم قرآن

فہم قرآن کے لئے ضروری ہے۔ کہ تکوین اور تشریح پر برابر کی نظر ہو۔ اور ایک وقت ایک مسلمان دونوں توحیدوں سے فطرتاً نسبت رکھتا ہو۔ اور دونوں توحیدوں سے بہرہ ور ہو۔ جو عالم مقام تشریح سے آگے نہ گذرے وہ اپنے مسلک توحید میں کامیاب نہیں ہوتا۔ جب تک اپنے اندر ذوق توحید تکوین سے نہ پیدا کرے گا۔ اور تکوینی صوفی صفات الہیہ سے روشن نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ وہ لباس شریعت سے آراستہ نہیں ہوتا۔ گو تکوینی توحید کے بلند مقام پر کتنا بلند ہو کر چکے۔

لفظی توحید

لفظی توحید کوئی قدر اپنے اندر نہیں رکھتی۔ اور نہ ہی اس توحید پر توحیدی ثمرہ مرتب ہوتا ہے۔ توحیدی ثمرہ کیا ہے؟ یہ کہ نفوس انسانی میں خود بخود جذب ہوتا جائے۔ اور کسی کو مترابی کی مجال نہ رہے۔ صاحب توحید کی آنکھ کا وار اس کے ہاتھ کے وار سے تیز ہو۔ اور اس کے دل کا زور اس کی زبان کے زور سے زیادہ ہو۔ بلکہ زبان گنگ ہو لیکن دل روشن اسرار الہیہ کی شعاعیں باہر بھینک رہا ہو۔ اور ایک دنیا مسحور نگاہ ناز و نیاز ہو۔

علمی توحید

علمی توحید علما کی موجودہ وقت لفظی ہونے کی وجہ سے بے اثر ہے۔ کتنے

دعظ ہو رہے ہیں۔ کتنے درس قرآنی شروع ہیں۔ جو نفوس اپنا دل لے کر حاضر ہوتے
بھی ہیں۔ وہ بھی اٹھتے ہیں۔ تو سر اٹھاٹھے ہوئے۔ آنکھیں ہیں تو بے باکانہ ادھر
ادھر پھرتی ہوئی ہیں۔ دل ہیں تو سر اسر خواہشوں سے پُر اور پریشان۔

حضرت موسیٰ کا قصہ مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے آیا ہے

یہ قصہ حضرت موسیٰ ہمیں تعلیم دینے کے لئے ہمارے سامنے رکھا گیا ہے۔ کہ ہر
صاحب علم کو شرعی توحید سے ایک قدم توحید تکوینی یا ذاتی کے لئے بڑھانا ضروری
ہے۔ اور اس کے لئے جیسے معلم کتاب کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی ایک مربی اور
مرشد کی ضرورت ہے۔ اب آیات مندرجہ بالا کی نشاندہی کر کے موقع بموقع نتائج
پیش کئے جاتے ہیں۔ تاکہ تحریر بالا کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۔ وَاِذْ قَالَ مُوسٰی لِفَتْنٰهٖ لَا اَبْرٰحُ حَتّٰی اَبْلُغَ مَجْمَعِ الْبَحْرِیْنِ
اَوْ اَمْضِیْ حَقْبًا ۗ طِب حَبْر۔ اور عزم کامل کا نمونہ آیتہ بالا دیتی ہے۔ کہ
سالک جب ہدایت ربی کے لئے نکلے۔ تو تمام تعلقات کو چھوڑ کر چلے۔ اور اپنی
ہمت اتنی رکھے۔ کہ سالوں گذر جاویں لیکن مقصد حاصل کئے بغیر نہ ہٹے گا۔ موسیٰ
علیہ السلام کو امر ربی ہوا۔ کہ آپ ہمارے خاص بندے کی تلاش میں چلیں۔ اور غالباً
مجمع البحرین کا نشان بھی دیا گیا۔ آپ کے خادم یوشع بن نون تھے جو آپ کے بعد
خلیفہ ہوئے۔ اب بھی دستور ہے۔ کہ جب ولی اللہ لوگ کسی خالص تربیت کے
لئے چلتے ہیں۔ تو وہ اپنا ایک خاص خادم (درویش) ساتھ کر لیتے ہیں۔ خدمت

کے سوا رفاقت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس سے بڑھ کر جس نعمت کے لئے وہ جا رہے ہیں۔ اس سے اپنے شاگرد کو بھی سیراب کرنا چاہتے ہیں۔ یہ مولائے کوئی عام آدمی نہیں۔ خدائے قدوس کے برگزیدہ اولوالعزم مرسل صاحب کتاب قورات ہیں۔

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ
 فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ۗ قَدَرَتْ خُودُ اس مقام پر پہنچ گئے۔ جہاں کی نشان دہی
 مولائے کریم نے فرمائی تھی۔ اور مچھلی جو کہ اپنے کھانے کے لئے بطور زاد راہ اپنے
 پاس تھی۔ ایک پتھر پر رکھی لیکن چلتے ہوئے آپ کے خادم حضرت یوشع نے تو
 پالیا۔ کہ مچھلی کہیں نکل گئی ہے۔ چونکہ حضرت موسیٰ سوتے تھے۔ دل میں کہنا
 جب اٹھیں گے تو کہدوں گا لیکن جب بیدار ہوئے۔ اور چلنے لگے۔ تو بھول گئے
 فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتَاهُ إِنِّي خَدَايَا لَقِينَا مِن
 سَفَرِنَا هَذَا نَصَبًا ۗ حضرت جب بہت کچھ دُور نکل گئے۔ اور تھک کر
 پور چور ہو گئے۔ تو فرمایا کہ کھانا لاؤ۔ کہ ہم اس سفر سے بہت ماندہ ہو گئے ہیں۔
 قَالَ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ
 وَمَا أَنسِيهِ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ
 فِي الْبَحْرِ عَجَبًا ۗ کہ جب پتھر پر بیٹھے تھے۔ تو اس وقت میں مچھلی کو بھول
 گیا تھا اور شیطان نے مجھے بھلا دیا۔ کہ آپ سے ذکر کرنا۔ وہ تو دریا میں چلی گئی ہے
 عجب طریقہ سے۔ بھول جانا بھی اللہ کی حکمت تھی۔ کہ ایسے سفر میں مجاہد کے
 وسیعے جانتے ہیں۔ اور تکالیف سے طبیعت کی تیزی کو ٹھنڈا کرنا مقصود ہوتا

ہے۔ نہ بھولتے تو لمبا سفر نہ کرنا پڑتا۔ اور کوئی مشقت اٹھانی نہ پڑتی۔ اور اس نعمت کی قدر نہ ہوتی جس کے لئے گھر سے نکلے تھے۔

کرامت کی حقیقت

پچھلی عرہ کا بھاگ نکلنا زندگی کے سوا کیسے ہو سکتا ہے۔ اور یہ تھی کرامت اس عبد صالح کی جس کی خدمت میں حضرت موسیٰ حاضر ہوئے۔ لائے جا رہے تھے۔ مولیٰ کریم اپنے خاص بندوں کو جب عزت بخشتے ہیں۔ تو ان کی عزت افزائی کے لئے ایسے امور ظاہر فرماتے ہیں۔ جو عام طور پر کرامت کے نام سے مشہور ہوتے ہیں۔ اور جو عقل سے بالا ہوتے ہیں۔ یہ ایک خاص نشان ہے۔ جو مولیٰ کریم اپنے بندوں کو دوستی و امان سے ممتاز فرمانے کے لئے عنایت فرماتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ واقعہ سنا۔ کہ پھلی زندہ ہو کر بھاگ گئی۔ تو فوراً تار گئے۔ کہ وہی مقام تھا۔ جہاں مجھے اس بندہ خاص کو تلاش کرنا تھا۔ قَالَ ذَٰلِكَ مَا كُنَّا نَبُغُ۔ یہی جگہ ہے جس کی تلاش ہمیں تھی۔ چنانچہ واپس اپنے پاؤں پر لوٹے۔

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا اتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا
وَعَلَّمْنَاهُ مِمَّنْ نَّوَدُّكَ عَلَيَّاهُ۔ تو اس بندہ خاص کو پا گئے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے اکرام فرما رکھے تھے۔ اور جسے اپنا علم خاص دے رکھا تھا۔ سبحان اللہ۔ مولیٰ کریم نے کیا تعریف حضرت خضر کی فرمائی۔ پہلے فرمایا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا۔ ہمارے خاص بندوں میں سے ایک خاص بندہ ہے۔ پہلے عَبْدًا کی تشریح سے

تعلیم و تفریح کا اظہار فرمایا۔ پھر مِنْ عِبَادِنَا کی قید لگا کر اور شان بلند فرمایا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی ظاہر فرما دیا۔ کہ ہمارے کئی مخلص بندے اور بھی اس قسم کے ہیں۔

یاد رہے۔ کہ عبد کا لفظ منصب و اخلاص خدائی کے لئے نہیں۔ اکثر انبیا کو اس لفظ محبوب سے سرفرازی بخشی گئی۔ نوح۔ ابراہیم۔ موسیٰ۔ ہارون۔ الیائس (سورۃ الصافات) سلیمان۔ داؤد۔ ایوب (سورۃ ص) کو سرفراز فرمایا گیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خضر کو پیغمبر نہ تھے لیکن درجہ میں کچھ کم بھی نہ تھے۔ یہ الگ بات ہے۔ کہ موسیٰ علیہ السلام رسول اور نبی تھے۔ بادشاہ بادشاہ ہوتا ہے اور وزیر وزیر، خواہ وزیر کا علم بادشاہ سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ عام سوال ہے۔ کہ موسیٰ علیہ السلام ایک نبی تھے۔ وہ غیر نبی کے پاس کیسے بھیجے گئے۔ جس کے جواب میں کہا جاتا ہے۔ کہ علم میں تو موسیٰ بلند تھے۔ لیکن ایک خاص علم کی تعلیم کے لئے۔ بیشک ایسے بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر خضر می علم موسیٰ علم کے برابر مان لیا جاوے۔ یا زاید ہی تسلیم کر لیا جاوے۔ تو پھر موسیٰ رتبہ اور منصب میں کیسے کمی آسکتی ہے؟ استاد در عایا ہوتا ہے۔ اور بادشاہ شاگرد ہوا کرتے ہیں۔ خود موسیٰ علیہ السلام جب حاضر ہوئے۔ تو خضر سوئے ہوئے تھے۔ جب کپڑا اکٹھا کر دیکھا۔ تو فرمایا۔ اِنَّكَ بِاَرْضِكَ السَّلَامُ۔ آپ پر سلام ہو۔ آپ اپنی زمین میں ہیں۔ یعنی میں ایک امت کا آدمی ہوں۔ پھر اس پر بس نہیں۔ فرماتے ہیں۔ وَ اَنْتَيْنَا رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا۔ کہ ہم نے اس کو اپنی رحمت خاصہ سے بھی سرفرازی دی۔ رحمت کے معنی فضل و کرم کے سوا اور کیا ہوں گے یعنی بڑے فضل و کرم کے آپ مالک ہیں۔ اس کے بعد وَعَلَّمْنَاهُ صِنْدِقًا عَلِيمًا

ہم نے اس کو اپنا علم خاص بھی دیا۔ ان الفاظ پر غور فرمایا جاوے۔

علم لدنی

یہ دینی کا علم نہیں۔ بلکہ یہ الہامی علم ہے۔ بشرییت والے تو وحی سے علم کو بلند کہتے ہیں۔ اگر ایسے ہی ہو بھی؟ لیکن اس علم لدنی کا کیا کہنا۔ جو بلا واسطہ مولیٰ کریم کی ذات سے کسی کو نصیب ہو۔ آج اس علم لدنی کے الفاظ پر اہل علم مسخر اڑاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ وحی کے سوا کوئی دوسرا علم قابل توجہ نہیں۔ نہ ہو لیکن قرآن حکیم خود تو اس کی بڑی تفسیر فرما رہے ہیں۔ اور مولیٰ جیسے پاک بستی اور بلند منصب رسول کو جس کی تعلیم کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ کیا اس قابل ہے۔ کہ ایک عالم دین مذاق اڑائے۔

جہاں نبی ہوتے ہیں اور رسول۔ وہاں اس علم لدنی والے بھی ہوتے ہیں۔ اور جب ان کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایک رسول کو ارشاد ہوتا ہے۔ تو پھر کیونکہ کتاب اللہ اور کتاب الرسول کے عالم کو اس سے بے نیاز خیال کیا جا سکتا ہے۔ دراصل کتاب و سنت کی تعلیم کامل ہی تب ہوتی ہے۔ جب تعلیم شرعی تعلیم کے ساتھ تکمیل کی جائے۔ ورنہ نامکمل ہے۔ کیونکہ شرعی تعلیم صفاتی توحید کا حصہ اور علم ہے۔ اور لدنی تعلیم ذاتی توحید کا حصہ اور علم ہے۔ اور جب تک اصل تک نظر نہ پہنچے شرع کی حقیقت نہیں کھلتی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اکثر اہل علم اپنے علوم ظاہریہ کی تکمیل کے بعد اپنی کمی کو محسوس کرتے ہوئے اہل طریقت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور اپنی اصلاح نفس اور تزکیہ کے لئے

مسائل ان کی خدمت میں رہے۔ اور پھر تسلیم کیا کہ جو کچھ پہلے تھا۔ وہ اس تزکیہ نفس کے سوا بے کار تھا۔

موسوی تعلیم کو حضری تعلیم سے چار چاند لگ گئے۔ اور ظاہر و باطن ایک ہو گئے۔ دل کی آنکھ جب ظاہر آنکھ کے ساتھ اٹھا دیکھے۔ تو پھر کوئی حقیقت حجاب میں نہیں رہتی۔ بلکہ خود ذات عز اسمہ کی جلوہ گری دل و جان اور آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اس وقت آنکھ نہیں دکھتی۔ جب تک دل نہیں دیکھتا۔ لیکن جب دل دیکھتا ہے۔ تو باطن عیاں ہو جاتا ہے۔ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا۔ کے مطابق نور الہی صورتہ نوری میں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اور یہ مقام صرف آنکھ کو میسر نہیں ہو سکتا۔

استاد کسی درجہ کا بھی ہو استاد ہے۔ اور شاگرد کے لئے لازم ہے کہ اس کی عزت کرے۔ بلکہ شاگرد کے ہر تباعدار کے لئے بھی اس کی توقیر واجب ہوتی ہے۔ مولیٰ علیہ السلام خواہ مرتبہ میں کتنے ہی بلند ہوں۔ نبی ہوں یا رسول ہوں۔ اور بادشاہ۔ اور ایک امت کے والی لیکن جب حضر کے پاس آتے ہیں۔ تو حضر کو نکر ان سے کم ہوں۔ اور کینو نکر ان کا ادب ان پر واجب نہ ہو۔ پھر ظاہر و باطن کا فرق کتنا عیاں ہے۔ ایک علم ظاہر اور ایک باطن۔ بے شک ظاہر کے بغیر باطن کا جلا نہیں ہوتا لیکن باطن کے سوا ظاہر کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ روح باطن ہے۔ اور جسم ظاہر۔ روح اپنے ظہور کے لئے تو جسم کی محتاج ہے۔ لیکن اپنے بقا کے لئے نہیں۔ اور جسم اپنے بقا کے لئے روح کا محتاج ہے۔ علم لکھتی اپنے ظہور کے لئے تو علم شریعت کا محتاج ہو سکتا ہے لیکن اپنی

ذات کے لئے نہیں لیکن علم شریعت اپنی ذات کے لئے علم لدنی کا محتاج ہے۔ اس کے سوا وہ سراسر لفظ رہ جاتا ہے۔ اور اس کے اندر کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

یہ خیال نہ کیا جائے۔ کہ مولیٰ علیہ السلام پہلے سراسر علم ظاہر سے آراستہ تھے۔ اور وحی سے تسلیم لیتے تھے ہی نہیں۔ وحی کے ساتھ بلا وحی بھی نبیوں کی تسلیم ہوتی رہتی ہے۔ اگر وہ ساتھ ساتھ نہ ہو۔ اور جلوہ ہائے الہی کی جھلک ان کے قلب پر اپنے جلو سے نہ دے۔ تو یقین کی دولت کسی صورت حاصل نہیں ہوتی۔ اس لئے ظاہری علم کے ساتھ باطنی علم برابر چلتا رہتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر ایسا ہے۔ تو پھر حضری تعلیم کی کیا ضرورت تھی۔ ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔ کہ کسی ایک علم میں کمال ہوتا ہے۔ صاحب شریعت اپنے علم میں کامل ہوتے ہیں۔ اور صاحب باطن اپنے باطن میں کمال رکھتے ہیں۔ ورنہ کوئی بھی ایک دوسرے سے کلی طور پر خالی نہیں ہوتا۔ لیکن تکمیل اسی میں ہے جس میں وہ کامل ہے۔ حضری اپنی تعلیم میں مکمل تھے۔ اور باطنی استاد ہونے کے قابل۔ اس لئے مولیٰ کریم نے حضرت مولیٰ کو ایک خاص تربیت باطنی علم کے حاصل کرنے کے لئے ارشاد فرمایا۔

میرے جد امجد حضرت غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ نسبت نکو بینی سے مشرف تھے۔ اور نہ بچپن ہی سے یہ نسبت ظہور پذیر تھی۔ پڑھنے جا رہے تھے۔ راستہ میں ان کی زمین پڑتی تھی۔ لوگوں کے مال مویشی چر رہے تھے۔ کسی نے کہا کہ اس زمین کا مالک کوئی نہیں۔ کہ سب کے مال مویشی چر رہے ہیں۔ آپ نے پرس کر مویشیوں کی

طرف دیکھا۔ اور چلنے لگے۔ حکمتِ خدا جو کوشی چر رہے تھے سب مر گئے۔

آپ کے تربیتی مرشد حضرت غلام نبی صاحب لٹھی تھے۔ اصل بیعت حضرت

غلام محی الدین قصوری سے تھی تعلیم حضرت لٹھی سے پائی تھی۔ اکثر جب کوئی

معاملہ باطنی پیش آجاتا تھا۔ تو آپ ان سے دریافت فرماتے۔ ایک بار ایک

مقدمہ غیر مقلدین میں چند عالم علاقہ ملزم تھے۔ جن میں ایک آپ بھی تھے۔ اور جہلم

میں عدالت تھی۔ صاحب عدالت کا رویہ ہمارے علما کے برخلاف تھا۔ لہ

شرف سے حضرت لٹھی رخصت ہونے لگے۔ تو آپ نے فرمایا معلوم نہیں اب

قید ہوتے ہیں۔ یا خلاصی پاتے ہیں۔ کیونکہ حاکم کا رویہ ہمارے خلاف ہے۔ تو

حضرت پیر بلوئی پاس گھرے تھے۔ جوش میں آکر فرمایا۔ آپ کو کون قید کر سکتا

ہے۔ آخر وہی بات ہوئی۔ اور بری ہو کر گھر تشریف لائے۔

ایک بار وبا پھوٹ پڑی۔ اور لہ شریف میں بہت لوگ مرے۔ آپ

نے خط حضرت پیر بلوئی کو لکھا۔ کہ پہلا خط جو آپ نے لکھا تھا۔ اسے پڑھ کر بھاڑ

دیا گیا۔ اس وقت آپ کے ایک عزیز میاں بیمار تھے) اب اس عزیز کے

بارے لکھا جائے اور ساتھ ہی یہ لکھا جائے۔ کہ ہمارے خاندان سے کس کس کی

باری ہے۔ دیکھئے پیر مرید سے پوچھتا ہے۔ کیوں! صرف اس لئے کہ پیر جانتا

ہے۔ کہ یہ عزیز اس نسبت کا مالک ہے۔

آپ کے صاحبزادہ صاحب کی شادی ہوئی۔ ہر خادم کے لئے الگ الگ

خدمت خضر فرمائی گئی۔ ایک خادم نے عرض کیا۔ کہ حضور موسم بردسات کا ہے۔ اور

تو سب کچھ ہو جائے گا۔ اس کا کیا ہوگا۔ آپ نے فرمایا۔ بیربل والوں کو بلاؤ۔

چنانچہ آپ حاضر ہوئے۔ فرمایا۔ آپ کے ذمہ ہے۔ کہ جب تک شادی کے ایام ہوں مینہ نہ برسے۔ آپ خاموش چلے گئے۔ آپ کی عادت تھی کہ خلوت میں رہا کرتے تھے۔ اس لئے اس موسم گرما میں بھی آپ مسجد کے اندر کونے میں بیٹھ گئے۔ ایک رات عشا کو گھنے بادل آگئے۔ اور آسمان سے قطرے برسنے لگے خادم دوڑتے ہوئے حضور کی خدمت میں گئے۔ کہ بارشس ہونے کو ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کہاں ہیں بیرل والے؟ ان کو جا کر کہو۔ جب انہیں کہا گیا۔ تو آپ نے حیران ہو کر پوچھا۔ کیا بارشس ہو رہی ہے؟ آپ باہر نکلے اور آسمان پر نظر ڈالی۔ فوراً بادل پھٹنے شروع ہوئے۔ اور اسی آن مطلع صاف ہو گیا۔ لیکن شادی کے بعد اللہ شریف پر ایک سال مینہ نہ برسا۔ آخر لوگ تنگ آئے۔ حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض بالذکر رحمت کے لئے کی۔ آپ نے جھٹ فرمایا۔ کہ اوہ! میں نے تو صرف شادی تک ان سے کہا تھا۔ کہ بارشس نہ ہو۔ یہ تو نہیں کہا تھا کہ ہمیشہ نہ ہو۔ آپ نے حضرت بیربلوی کو خط لکھا۔ کہ ہم نے ہمیشہ کے لئے تو بارشس روکنے کے لئے نہ کہا تھا۔ آخر بارشس ہوئی۔

حضرت بیربلوی خود فرماتے تھے۔ کہ ایک بار اللہ تعالیٰ نے میری بڑی عزت رکھی۔ کہ حضور نے کچھ پیر اور جو کے بھنے ہوئے دلے اور قدرے گڑویا۔ اور فرمایا رکھ دو۔ چنانچہ میں نے ایک گھڑے میں رکھ دیا۔ اس وقت آپ اللہ شریف میں پڑھتے تھے۔ جب موسم گرما آیا۔ اور حضرت دھنی کے سفر کے لئے تیار ہوئے۔ تو مجھے بلایا۔ اور فرمایا۔ میاں وہ لمانت لاؤ۔ لیکن جب میں نے گھڑے میں ہاتھ ڈالا۔ تو اندر کچھ نہ تھا۔ حیران ہو کر دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ کہ اب میں کیا عرض کروں۔ آپ فرمائیں گے کہ تو ہی کھا گیا۔ اتنے میں ایک عورت

اٹی۔ اس نے بیر۔ اور دلنے اور گڑھے سے دیکھا اور میں نے لے کر حاضر ہو گیا۔ اور پیش کر دیا۔

یہ ہے گوینی یا اویسی نسبت۔

فرمایا کہ ایک بار تو تیار بنو رہے میرے ابو پر ڈنگ دیا۔ جب میں سبق کے لئے حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور میرے چہرے کو دیکھا۔ تو آپ نے مہم فرمایا۔ لیکن قدرت خدا جب میں دوسرے دن سبق کے لئے حاضر ہوا۔ تو آپ کا ابو بھی متورم تھا۔

مولوی محبوب عالم صاحب کو اپنے پیر و مرشد حضرت پیر بلوئی سے بڑی محبت تھی۔ اور ان کے والد حضرت لٹھی کے مرید بھی تھے۔ مگر بعض وقت فرط محبت سے ایسی باتیں نکل جاتی تھیں۔ کہ شان حضرت لٹھی میں گستاخانہ خیال کی جاتی تھیں۔ اور وہ بھی حاسدین حاشیہ آرائی کر کے زیادہ چمکانے لگے۔ اس پر حضرت لٹھی حضرت پیر بلوئی پر ناراض ہو گئے۔ کیونکہ آپ بہت ہی باریک بین تھے۔ حضرت لٹھی نے ایک خط بیزاری اور بریت کا بیرل لکھ دیا۔ کہ نہ تم میرے مرید۔ اور نہ میں تمہارا پیر۔ تم جانو اور تمہارا کام۔ اور تمہارا اجازت نامہ ختم۔ ہاں تم چاہتے ہو۔ کہ تعلق قائم رہے۔ تو از سر نو بیعت کرو۔ اور ایک اونٹ مرید ہو کر آؤ۔ جس کا جواب بڑی تواضع اور انکساری کے ساتھ عرض کیا۔ کہ آپ کی بڑی مہربانی ہے۔ کہ مجھے دوبارہ اپنی سلک عقیدت میں لے لیوں۔ میں ہر طرح حاضر خدمت ہونے کے لئے تیار ہوں۔

ادھر محبوب عالم صاحب کو حضرت پیر بلوئی نے بیزار نامہ لکھ دیا۔ کہ تم ہرگز بیرل نہ آنا جب تک حضور راضی تم پر نہ ہوں۔ مولوی محبوب عالم صاحب بیمار

ہو گئے۔ مہینوں چار پائی پر پڑے رہے۔ اور اپنے والد قبیلہ کو حضرت للہی کی خدمت بھیجتے رہے۔ آخر راضی ہوئے۔ اور رضانا مہ لے کر پیر مل جب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو مولوی صاحب قدموں پر سر رکھے رو رہے تھے۔ اور حضرت کے آنسو ان کے سر پر پڑ رہے تھے۔ اور ناز و نیاز سے گھلے جا رہے تھے۔

لیکن جب بادل ٹل گیا۔ اور حضرت راضی ہو گئے۔ تو حضرت قبیلہ للہی کو معلوم ہوا۔ کہ سب حاسدین کی باتیں تھیں۔ حضرت سیر بلوئی کا کوئی قصور نہ تھا۔ تو وہ پہلے سے بھی زیادہ با اخلاص ہو نکلے۔ اصل میں یہ تربیت جلالی کے انوکھے راز اور انوکھی تربیت تھی۔ جو دوسرے کسی مرید کے حصہ میں نہ آتی تھی۔ محبوب عالم صاحب نے اس جدائی پر پورا ایک دیوان فارسی میں لکھ دیا۔ جوں جوں اشتیاق و محبت اور سوز و گداز اندر رکھو لیتا تھا۔ وہ بصورت اشعار باہر نکلتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک علاقہ میں مولوی محبوب عالم کی دھوم مچ گئی لیکن بے پار سے اپنے پیر کی جیات میں فوت ہو گئے۔ مرنے سے پہلے ایک قصیدہ لکھا جس میں کہا۔ کہ اگر آپ میری قبر پر آئیں گے۔ تو آپ دیکھیں گے۔ کہ میں محمد کے اندر سر و قد تعظیم کے لئے کھڑا ہوں گا۔ آخر یہ کیا ہے۔ یہ محبت ہے جو ہر ہر مرید کو گوندن بنا دیتی ہے۔

جائے کہ زاہداں بسزار اربعین رسد

نست شراب عشق بیک آہے رسد

حضرت قبیلہ میان صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس پر فرمایا کرتے تھے۔ انہوں نے

پچاس کی اور سچ سو کا۔ یعنی بعض وقت مرید پیر سے بڑھ جاتا ہے۔ تو تعجب

نہیں کرنا چاہیے۔ کہ روئے کی تعلیم بلند تھی۔ یا حضری تعلیم زیادہ۔ ایسا
ہونا چلا آیا ہے۔

اکثر دفعہ حضرت لکھی اپنے متوسلین کو دنیاوی مشکلات کے حل کے لئے حضرت بیر بلوی
کے پاس بھیجتے رہتے تھے اور آپ بابر پر خدمت انجام دیتے تھے۔ مفتی صاحب میا لوی نے
کسی آدمی کو قرض کی مصیبت سے نجات دینے کے لئے بھیج دیا وہ تین دن راجب چلنے لگا۔ تو
اپنے پانچ روپے دے دیے۔ وہ حیران۔ کہ میں تو ایک مصیبت کے ٹالنے کے لئے آیا تھا۔
حضرت نے یہ کیا شرمندہ کیا۔ لیکن حضرت کے جلال کی وجہ سے کچھ عرض نہ کر سکا۔ آخر مفتی صاحب
کی خدمت میں جب حاضر ہوا۔ تو اپنے دریافت فرمایا۔ تو پانچ روپے نکال کر رکھ دیئے۔ کہ
اور تو آپ نے کچھ نہیں فرمایا۔ یہ پانچ روپے دیئے ہیں۔ مفتی صاحب تار گئے۔ فرمایا سا ہو کار کو
بلاؤ۔ جب حاضر ہوا۔ تو کہا اس کا حساب چکاؤ۔ سا ہو کار بھی کے پتے بہتیرے الٹ پلٹ
کئے۔ لیکن پانچ روپے کے سوا کوئی باقی نہ تھی۔ وہ دے دیئے۔ اور لکیر کھینچ دی گئی۔
اس نسبت کے کہ شے بڑے بڑے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اور دیکھنے والے دیکھتے
ہیں۔ شاہ دگر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اکثر مجازیب اس نسبت سے تعلق رکھتے ہیں۔
دنیاوی امور میں تو یہ نسبت بادشاہ ہوتی ہے۔ کن شیکون کا نمونہ دکھاتی ہے۔ اور ناممکن کو
ممکن بنا دیتی ہے۔

مولوی محمد عظیم نے خط لکھا۔ کہ چوہدری نے مسجد سے ٹوٹ کاٹ لیا
ہے۔ جواب میں لکھا۔ کہ جس نے مسجد کا ٹوٹ کاٹا۔ اس نے اپنا گلا کاٹ دیا۔
ایسے ہی ہٹھا۔ کہ وہ فوراً ہی مر گیا۔

احمدیہ ضلع گوجرانوالہ کی گلی میں حضرت قبلہ بیر بلویؒ کھانا کھانے کے

لئے جا رہے تھے۔ ہونی کی رات تھی۔ ایک چھپنی (ہوائی) آپ کے پاؤں پر آگئی۔ آپ نے مڑ کر دیکھا۔ ایک ہندو لڑکے سے چھوٹی تھی۔ تو رات ابھی پوری نہ ہوئی تھی۔ کہ وہ لڑکا مر گیا۔

ایک دفعہ آپ باہر تشریف لے جا رہے تھے۔ کہ ایک کتا بھونکتے بھونکتے پیچھے ہو گیا۔ لیکن جب قریب پہنچ گیا۔ تو آپ نے مڑ کر دیکھا۔ کتا وہیں بیٹھ گیا۔ اور پھر جب تک زندہ رہا۔ وہ نہ بھونکا۔

حضرت قبلہ پیر مہر علی شاہ صاحب کی بڑی دھوم صلح شاہ پور میں تھی۔ آپ ایک بار نئی تحصیل خوشاب میں گئے۔ بڑے پر شکوہ استقبال ہوئے۔ اور بہت بڑا ہجوم آپ کی تشریف آوری پر ہوا۔ قاضی عطا محمد صاحب حضرت پیر بلوچی کے خلیفہ بھی وہاں رہا کرتے تھے۔ جب حاضر ہوئے۔ تو پوچھا کہ پیر صاحب تشریف لے گئے تھے۔ انہوں نے کہا۔ بڑی دھوم مچی۔ اور بڑے لوگ زیارت کے لئے گئے۔ آپ نے پوچھا۔ تم بھی گئے تھے۔ عرض کیا نہیں حضور۔ میں تو مسجد میں ہی بیٹھا رہا۔ نہایت خوش ہوئے۔ فرمایا شاہباش۔ اس کے بعد فرمایا۔ کہ آئندہ نئی نہ جاویں گے۔ چنانچہ نئی کے ارد گرد تو آپ جاتے رہے اور معتقدین لے جاتے رہے لیکن نئی میں پھر کسی نے آپ کو دعوت نہ دی۔ اور نہ آپ تشریف لے گئے۔

آئندہ کے حالات سے نہایت لطیف پیرا یہ میں گاہ گاہ ارشاد فرما دیتے تھے۔ ایک بار کفری میں حضرت عثمان کی خانقاہ میں تشریف لے گئے۔ حضرت بڑے پاک سے ملے۔ اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ خدام سے رخصت کے بعد

فرمایا۔ کہ آج ایک مرد نقشبندی دیکھا ہے۔ اور جب آپ سو دھی اپنی ہمیشہ صاحبہ کے پاس پہنچے، تو ہمیشہ صاحبہ نے پوچھا۔ فقیر صاحب کو دیکھا۔ فرمایا۔ فقیر بڑے باکمال ہیں لیکن عمر کم ہے۔ چنانچہ اسی سال آپ رحلت فرما گئے۔

ایسے ہی مولوی قمر الدین صاحب نے ایک زمیندار کے لئے تعویذ طلب کئے۔ اور دعا کی التجا کی۔ آپ نے تعویذ ارسال کر دیئے۔ اور خط میں لکھ دیا۔ کہ اللہ تعالیٰ شفا بخشے لیکن پیشانی صفحہ پر ج۔ ی۔ س۔ م لکھ دیا۔ جب مولوی صاحب نے دیکھا تو پا گئے۔ کہ ہفتہ کو جو ایام چلے گا۔ ایسے ہی ہوا۔

فرمایا کرتے تھے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں شیشہ اور تلوار دیئے ہیں۔ جب کبھی

کسی پر غیرت کی نگاہ پڑی تباہ ہو گیا۔ جب بھی آپ کے خاندان سے کسی نے چھیر چھاٹکی ہے۔ تو نتیجہ اسکی ہلاکت ہوتا ہے۔ باوجودیکہ آپ کی یہ نسبت تکوینی اتنی باند تھی۔ پھر بھی بہت بڑے شیعہ شریف کے پابند تھے۔ علوم ظاہریہ کا درس بھاری جاری کر رکھا تھا۔ اور کسی چندہ کے بغیر چلتا تھا۔ عموماً انسی۔ نٹو کے درمیان طلبہ رہتے تھے۔ اور ہر طرح کی ذمہ داری ان کی اٹھاتے تھے۔ میں نے بھی اپنی ابتدائی کتابیں آپ کی زندگی میں گھر پڑھی تھیں۔ آپ کے تین صاحبزادے تھے۔ اور آٹھ پوتے۔ سارے حافظ قرآن ہوئے۔ اور میرے ساتھ صاحب اور دونوں چچا اچھے عالم تھے۔ اور کئی عالم بھی تعلیم دیتے تھے۔ کتب خانہ اتنا بھاری تھا۔ کہ مغربی پنجاب میں کوئی شخصی کتب خانہ اسکا نہ اس وقت مقابلہ کر سکتا تھا اور نہ آج۔ لیکن قدیم کتب میں۔ مسجدوں کے سوا کوئی تعلیم پسند نہ فرماتے تھے۔ لیکن اپنی مسجد پر اپنی رکھی تھی۔ کہ میرا کئی پسند ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اتنا جذبہ تھا۔ کہ صرف زبان تک اکتفا نہ تھا۔ بلکہ ضرورت پر پیدم (ہاتھ سے) کا معاملہ بھی ہو جاتا تھا۔ اور طلبہ چل پڑتے تھے۔

جب آپ پہلے بہل فارغ التحصیل ہو کر گھر تشریف لائے۔ تو اس وقت اس گاؤں بیرل میں سیدوں کا خاندان ممتاز تھا۔ لیکن بے علم تھے۔ ایک سید زادے نے ایک مٹی سے ناچ کرایا۔ آواز آئی۔ تو آپ نے دریافت فرمایا۔ اصل حال عرض کر دیا۔ آپ نے ایک درویش کو بھیجا۔ کہ ان کو منع کرو۔ لیکن جب درویش منع کے لئے اکھاڑے میں گیا۔ تو سید زادے نے ارشاد سن کر کہا۔ کہ یہ لوگ اسداڑا ہے میاں دا نہیں۔ یعنی گاؤں ہمارا ہے۔ میاں کا نہیں۔ جب درویش واپس آیا۔ تو آپ نے دریافت فرمایا۔ کہ کیوں ابھی تک آواز آ رہی ہے۔ تو اس نے وہ الفاظ دہرائے۔ اس پر آپ کے منہ سے نکلا۔ کہ گاؤں نہ میرا نہ تیرا۔ بلکہ خدا کا۔ وہ دن گیا۔ اور آج کا آیا۔ تقدیر الٹ گئی۔ سید خاک ہوتے گئے۔ عزت کی جگہ ذلت آگئی۔ دولت کی جگہ مفلسی نے قدم آرکھے۔ اور خاندان کے افراد تباہ ہونے لگ گئے۔ آج اس تمام خاندان میں صرف دو بچے ہیں۔ وہ بھی ان کے والد آئے۔ اور اپنی حالت زار کا ذکر کیا۔ اور آنسو برس رہے تھے۔ ساتھ ہی ان کی اس حالت سے ایسے متاثر ہوئے کہ آپ کے بھی آنسو کھپوٹ آئے۔ اس روز کے بعد اس کے گھر کچھ حالت بدلی۔ اور اللہ تعالیٰ نے دو سید زادے دیئے۔

غرض شریعتِ حقہ کا احترام جتنا میں نے آپ کی زندگی میں یہاں دیکھا۔ اتنا کسی خانقاہ۔ اور کسی مدرسہ اور کسی عالم کے ہاں دیکھنے میں نہیں آیا۔ ایک بار حضرت سجادہ نشین صاحب سیال شریف جناب خواجہ محمد دین صاحب چاچر میں تشریف لائے۔ اور قوالی حسب عادت طریقہ چشتیہ کرائی۔ آپ کو جب یہ خبر پہنچی تو آپ نے ایک خط آپ کے نام بھیج دیا۔ جس میں لکھا

تھا۔ کہ یہ ہمارا علاقہ ہے۔ جہاں شریعت کا کامل احترام ہے۔ آپ اپنے گھر میں جو چاہیں کریں لیکن آئندہ یہاں ایسے نہ ہو۔ سبحان اللہ۔ بزرگ بھی کیا حوصلہ مند ہوتے تھے۔ اجاب حلقہ نے پوچھا۔ کہ کیا خط ہے۔ آپ نے کہا۔ کہ بھائی صاحب شریعت ہیں۔ جو چاہیں لکھیں۔ آپ کی خانقاہ خانقاہ نہ تھی۔ ایک مدرسہ دینی تھا۔ آپ کسی کو باطنی تعلیم کی ترغیب نہ دیتے تھے۔ اور نہ خود اس کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ معمولی طور پر جو لوگ آجاتے۔ کچھ رسمائاً ان کی طرف التفات ہوتی۔ خود بڑا مطالعہ فرماتے۔ استفتاء کے جواب دیتے۔ احکام شریعت بڑے زور سے جاری فرماتے۔ رمضان شریف کا بہت بڑا احترام ہوتا خود حافظ تھے۔ عمر بھر کامل بیس رکعت تراویح روزانہ پڑھنا معمول تھا۔ آخری ایام جب آپ پر فالج گرا۔ تو پورے اڑھائی سال بیمار رہے۔ پانچوں نمازیں باجماعت ادا فرماتے۔ دو رمضان شریف خود میں نے قرآن حکیم آپ کی اقتلابی تراویح میں آپ کو سنایا۔ جبکہ آپ فالج کے بیمار تھے تیمم کے برخلاف تھے۔ ہر مرض میں آپ ہمیشہ وضو سے نماز ادا کرتے رہے۔ اور نبی کریم کے اتباع میں کسی کو اپنا جانشین ظاہر طور پر الفاظاً مقرر نہیں کیا۔ ہاں عملاً اپنے بڑے صاحب زادہ صاحب یعنی میرے والد بزرگوار کو مصیبت پر کھڑا کر دیا۔ نہ خود کسی کی طرف دیکھتے نہ کوئی آپ کی طرف دیکھ سکتا تھا۔ سراسر خاموش رہتے۔ مولوی محبوب عالم سوہاوی نے اس حال کا پنجابی میں کیا عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔

ادہ اک لحظہ جدا نہ ہووے رب تھیں

وہی خاموش حیراں اس سبب تھیں

یہی قدموں پر گرنا تھا۔ اور جانتا رہی کے جذبہ سے معمور تھا۔ امیر و غریبے یکساں سلوک تھا۔ کھاتے میں فقیروں کو امیروں کے ساتھ کھلاتے تھے۔ اور امیر کو فقیروں میں بٹھاتے تھے۔ یہ تھی وہ نسبت جس کی بدولت کائنات چل رہی ہے۔

ایسا ہی حال تھا غوث علیؒ کا۔ آپ تذکرہ پڑھیے۔ توحیدی رنگ میں کیا کیا گل کھلائے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے اس دنیائے شریعت سے انسان آگے گزر جاتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کائنات کا خیر و شر سب خیر ہی خیر ہے۔

ہر چہ آید در نظر از خیر و شر
جملہ ذات حق بود اے بخبر

لیکن جب ان کی عملی زندگی دیکھیے۔ تو سراسر عبادت تھی۔ ایک آن بھی عبادت کے سوا نہ گذرتی تھی۔ اور شریعت پر استقامت تھی۔ جب آخری وقت قریب پہنچا۔ تو خادم سے کہا۔ کہ مجھے وہاں دفن کرنا۔ جہاں خدائی رحمت کے سوا مجھے کوئی سہارا نہ ہو۔ اور کسی بزرگ کے پہلو میں دفن نہ کرنا۔ خادم نے عرض کیا کہ قلندر صاحب کے پہلو میں آپ کو دفن نہ کیا جائے؟ فرمایا زندگی میں کچھ وہاں سے نہیں ملا۔ تو موت کے بعد ان سے کیا ملے گا۔ حالانکہ تین سو سال منواتہ آپ کی خانقاہ میں فرائض کے سوا تمام لواقل ادا فرماتے رہے۔ اور مجاورت اختیار کر رکھی تھی۔ غور فرمائیے۔ کہاں سے کہاں تک یہ نکل جاتے ہیں۔

اے ان لوگوں کو اعمال پر بھروسہ نہیں ہوتا۔ صرف رحمۃ الہیہ پر ہوتا ہے جس وجہ سے اللہ ہر جانے ہیں۔ یہ فقرے سب کچھ ظاہر کر رہے ہیں۔ ۱۲

پھر اس بلند نسبت کو جب آپ دیکھیں گے۔ تقدیر مقدر سے کھلتی نظر آئے گی۔
اور پوری مومن کی شان و آن دکھائے گی۔ اقبال کا مدعا بالکل اس کے مطابق نظر آتا ہے
۴۔ ”نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں“

موضع بیہوشی تحصیل پھالیہ میں ایک ہندو فقیر کی کٹیا تھی۔ ایک تھانیدار صاحب مسلمان
کا گذر ہوا۔ اور وہاں بیٹھ گیا خلقت ساتھ تھی۔ لیکن سائیں اپنی پوری استقامت سے بیٹھا رہا
کچھ دیر کے بعد فقیر سے مخاطب ہوا۔ اور کہا۔ کہ یہ چرنوں کرنا کیسے۔ فقیر نے سر اٹھایا۔ اور
کہا میں کون کتا۔ جس کے سامنے گر رہے ہیں جس کو گور رہے ہیں۔ گر رہے ہیں۔ تھانیدار
صاحب خاموش ہو کر رہ گئے۔

یہ قصہ اس لئے پیش کیا ہے۔ کہ کسی... مسلمان کے دل میں یہ خیال ایک گھڑی بھی
نہیں آسکتا۔ کہ کوئی اس کے سامنے سر رکھے ہوئے ہے۔ بلکہ وہ تو خود خدائے قدوس
کے سامنے اس کا سر دیکھتا ہے۔ تاہم کبھی حقیقی نسبت بننے کوں اور اولیاء نے
یہ مشرکانہ طریقہ پسند نہیں کیا۔ بلکہ اپنے متوسلین کو روکتے رہتے ہیں لیکن جب
اصل فقر ہوئے لگتا ہے۔ اور جانشین ادھورے مسند ارشاد پر بیٹھ جاتے ہیں۔
تو پھر واقعی تمام مشرکانہ فعل ظہور کیڑے لگتے ہیں جس کے لئے بتنا داویلا کیا
جائے کم ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے

میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد

زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

جیسے سپیرا سانپ سے کھیلتا ہے۔ یہ نسبت اسی طرح تقدیر سے کھلتی

۵۔ میں دہج میں درہ گئی کائی جد میں سنت پیارے لائی

ہے پیرے کی موت بھی سانب سے ہوتی ہے۔ آخر یہ بھی ایک دن تقدیر کے ساتھ ٹکرا کر چور ہوتی ہے۔ منصورہ سرد خود تقدیر تھے لیکن جب وقت آیا۔ تو تقدیر کے ماتھوں سولی پر چڑھے لیکن جس سربا بے خونی سے چڑھے۔ یہ عشق ہی کی شان ہے اور لطف یہ کہ حق پرست علمائے کرام سے ایک حق پرست صوفی کو نصیب ہوئی۔ واہ تقدیر یاں تیریاں۔ یعنی تقدیر خود صاحب نسبت پر غالب آجاتی ہے۔ ہاں نڈر بڑی ہے۔ نہ موت سے ڈرے۔ نہ زندگی سے اسے لطف۔ موت و زندگی اس کے لئے یکساں۔ دنیا و آخرت اس کے سامنے برابر۔ اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ہ کے مطابق ہو جاتے ہیں۔ اور ہر دم تازہ۔ کوئی بنے یا بگڑے یہ اپنے نشہ توحید میں سرمست۔ اور پھر جب اس نسبت کے بزرگ مرتے ہیں۔ تو ان کی قبروں سے بھی نور توحید کے نور سے اٹھتے ہیں۔ قبر پرستی لعنت سہی لیکن حق پرستی کیوں نہ جلو سے رہے۔ دنیا آتی ہے۔ اور فیض پاتی ہے۔ حضرت داتا گنج بخش کی قبر میں کیا رکھا ہے۔ رات دن قرآن دایں بائیں پڑھے جا رہے ہیں۔ اور عبادت مشرق و غرب میں ہو رہی ہے۔ طواف نا جائز نہ ہی لیکن کون لے کے۔ برابر چکر چکر ہو رہے ہیں۔ کیونکہ صفت توحیدی اپنا رنگ دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ بے شک ظاہراً شرک ہے۔ لیکن حقیقت پر نظر ہو تو شرک کیسے۔ وہ تو فنا ہو چکے۔ اور فنا در فنا ہو چکے۔ جن کی پوجا ہو رہی ہے باقی ہے۔ تو صرف وہی جسے پوجا جاتا ہے۔ جس کی عبادت ہوتی ہے۔ اس صورت میں شرک کیسے لیکن شرعاً وہی حکم ہو گا۔ جو صاحب نسبت اپنی زندگی میں دینے

سے ہاں! اللہ کے دوستوں کو نہ تو کوئی خوف ہوتا ہے اور نہ غم

تھے۔ کہ سب کچھ شرک ہے۔ سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ۔

نذر ہونے کی مثال

عطار دکان پر بیٹھے تھے۔ ایک فقیر آیا اور کہا۔ کہ مرنا نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے مرنا نہیں۔ کیسے مرے۔ فقیر وہیں بانس میں جبت لیٹ گیا۔ اور پیالہ سر نہانے رکھا۔ دیکھا تو مہرچکا تھا۔ عطار رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیکھ کر دکان بند کی۔ اور راہ مولیٰ اختیار کر کے الگ ہو بیٹھے۔ یہ لوگ اس دنیا سے دوسری دنیا (آخرت) میں جانے کو انتقال مکان خیال کئے ہیں۔ اور فنا کو ہم جیسے نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ مرنا ان کے نزدیک کوئی پریشانی کن اور مکروہ چیز نہیں۔ فَتَمَتُّوا السَّمَوَاتِ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔ اگر تم سچے ہو تو موت مانگو۔ کا مصداق ہو کر دنیا میں روشن ہوتے ہیں۔

نسبت تکوینی

تکوین۔ کون سے ہے۔ جس کے معنی ”ہونا“ کیا جاسکتا ہے۔ مکان بھی اسم طرف اسی سے ہے۔ کونین (دو جہان) لَا مَوْجُودٌ فِي الْكُونَيْنِ إِلَّا هُوَ۔ سے کونین کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ تکوین جیسے نظم سے تنظیم ہے۔ ایسے ہی کون سے تکوین۔ تکوین بمعنی پیدائش۔ یہ صفت اللہ ذات ربی ہے۔ جس کے ذریعہ عالم کون و فساد پیدا ہوا۔ اس سے پہلے گو ذات ربی اپنی پوری آن بان سے موجود تھی۔ لیکن اُس کے سوا کسی دوسری ہستی کو اُس کا علم نہ تھا۔ اُسے خود اپنی جلوہ آرائی کے لئے آئینہ جمال نما کی خواہش پیدا ہوئی۔ کہ اس کا جمال کتنا اچھا ہے

توصفت خلق یا تکوین کا ظور فرمایا۔ اور دنیا آمو جو ہوئی۔ باقی تمام صفات متشار کہ ہیں۔ یعنی سمیع۔ علیم۔ بصیر۔ وہ ذاتی طور پر ان صفات کا مالک ہے۔ اور ہم صفاتی طور پر یا انعکاسی طور پر ان اوصاف سے بہرہ ور ہیں۔ لیکن صفت خلق یا تکوین میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ اور جو پاک نفوس کو اس کی قدرتِ فیاضہ یہ مہربانی فرمادے کہ اس صفت تکوینی کا علم حسبِ مقدر طبع انہیں عنایت فرمایا جائے۔ انہیں حسبِ نسبت تکوینی کہا جاتا ہے۔ اور یہ نسبت تشریح سے ایک قدم بلند ہے۔ کیونکہ تشریح احکام اور نواہی الہی کا نام ہے۔ جو ہر صورتِ خلقت اور تکوین کے بعد آتے ہیں۔ کوئی نسبت تشریحی ایسی نہیں جو نسبت تکوینی سے خالی ہو۔ کیونکہ ذاتی نسبت کے سوا صفاتی نسبت کیسے قائم اور عارض ہو سکتی ہے۔ لیکن بعض پر تکوین غالب ہوتی ہے۔ اور بعض پر تشریح۔ ذہنی تکوین بے ہوش ہے۔ اور ذہنی تشریحیت جسم بے جان۔ اس لئے ہر مذہب کے لئے علم تکوین بطور جان اور علم تشریحیت بطور جسم خیال کئے جاتے ہیں۔ اسلام میں یہ امتزاج بدرجہ اتم رکھا گیا ہے اور ایک دوسرے کو ایسے پیوستہ اور باہم جان کر دیا گیا۔ کہ ایک کو ایک سے جدا کرنا مشکل ہے۔ قرآن حکیم پڑھئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات مطالعہ کیجئے۔ ہر جگہ دونوں نسبتوں کی مساوات نظر آئے گی۔ اور ان نسبتوں کو جدا کرنا۔ اور جدا دیکھنا اسلام نہیں۔ بلکہ کچھ اور ہے۔

نسبت۔ تعلق کا نام ہے۔ اور طریقت اور تصوف کی اصطلاح میں تعلق باللہ کا نام ہے۔ اور یہ کیفیت ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے احکام کی تابعداری سے پیدا ہوتا ہے۔ اور بعض فطرت سلیم روزِ ازل سے اس کیفیت کو لئے کر عالم وجود میں آتی ہیں۔ یہی

لوگ پاک ہستیاں دنیا میں معروف و مشہور ہو کر دنیا کے لئے ہدایت کی علم بردار ہوتی ہیں۔ اور صحیح نمونہ قدرت خدا ہو کر جلوہ گر ہوتی ہیں۔

نسبتِ خضریٰ

خضر پر نسبتِ تکوینی کا غلبہ تھا۔ اور موسیٰ پر نسبتِ تشریح کا ظہور کامل تھا۔ جیسے پھل کا گدا گیا۔ اسی نسبتاً خضریٰ یا تکوینی کے بلند مدارج دکھانے اور خاص بنیادی مصلحت کے سولہ کریم نے حضرت موسیٰ کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے حضرت خضریٰ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارشاد فرمایا۔ اور یہ مہر ہے۔ کہ صاحبِ علوم گماہر ہے گو باطنی علوم حاصل کرنے کے لئے کسی صاحبِ تکوین کی خدمت میں حاضر ہو کر باطن کو مکمل کرنا چاہیے۔ تاکہ تقویٰ کے بلند مدارج پر کامیابی ہو۔ اور خالق اللہ کے رشد و ارشاد کی نظری منزل طے ہو تاکہ رشد و ارشاد کے اندر برکت پیدا ہو۔ اور دنیا یقین الہی سے پڑھو۔ اور شک و گمراہی سے نجات پائے۔

خضریٰ صورت

اس صورتِ خضریٰ اور موسوی سے یہ پتہ بھی چلتا ہے۔ کہ بعض نفوس قدسیہ ایسے ہیں۔ کہ وہ اپنے کمال میں کامل و اکمل ہیں لیکن گناہم زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور بعض رشد و ارشاد طریقت میں ممتاز ہونے کے باوجود ایک درویش کے علم کے محتاج ہیں۔ اس کی حکمت وہی جانتا ہے جس نے اپنی حکمتیں اور مصلحتیں کلی طور پر کسی پر نظر نہیں فرمائی ہیں۔

پھر عالیٰ حضرت کے اندر وہ تمام کمالات موجود تھے۔ جو نبیوں کے ہوتے ہیں
 جیسے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا عَلَمَاءُ اُمَّتِي كَاَنْبِيَاءِ
 بَنِي اِسْرَائِيْل۔ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کے برابر ہیں۔
 انبیاء کو پہلے جس لفظ سے نوازا گیا ہے۔ وہ عبادت ہے۔ اس کے بعد رحمت خاصہ
 کی عنایت ہے۔ اس کے بعد علم لدنی کی نوازش۔ یہ نبیوں کے عنایات خاصہ کو
 نصیب ہیں۔ گو نبی نہیں لیکن نبی کے شان سے کم بھی نہیں۔ ایسے ہی بعض
 خاص بندے جن کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔ ایسے ہی جو مدارج میں بہت بلند
 ہیں لیکن دنیا کی آنکھ میں عام طور پر ظاہر نہیں۔ ہاں ایسے دکھے ان کو جانتے
 ہیں۔ کیونکہ کوئی بھی نہ جانے۔ تو یہ معشوقی کیسی۔ آخر کوئی تو عاشق ہو۔ اب پھر
 سلسلہ قرآن حکیم کی طرف توجہ کریں۔

قَالَ لَهُ مُوسَى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰى اَنْ تُعَلِّمَنِيْ مِمَّا عَلَّمْتَنِيْ
 رُشْدًا ۗ مَوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ نے جب حضرت کو پالیا۔ اور دل میں ان کے چہرے
 بشرے سے یقین پیدا ہو گیا۔ کہ یہی وہ مرد خدا ہے جس کی تعلیم طریقت کے لئے
 بھیجا گیا۔ تو آپ نے حضرت خضر سے عرض کیا۔ میں آپ کا تابع رہتا ہوں۔ اگر
 آپ مجھے علم رُشد (طریقت کا علم) سکھادیں۔ یا بتلادیں۔

مرید و پیر یعنی مسترشد اور مرشد

مذکورہ بالا آیت میں وہ تمام چیزیں آگئی ہیں جن سے علم و وسیت حضرات گھبراتے ہیں۔
 مسترشد یا مرید۔ پیر یا مرشد۔ بیعت اور نسبت کچھ اور نہیں۔ یہی ہے۔ کہ مرید اقرار اور

عہد کرے۔ کہ وہ اپنے رہبر کی اطاعت اور فرماں برداری کرے گا۔ سو یہ موجود۔ اور اس علم کے لئے نہیں۔ جسے علم شریعت کہا جاتا ہے۔ بلکہ یہ رشتہ رکچہ اور ہے۔ ورنہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو خود صاحب شریعت تھے۔ یہ بھی خیال نکل گیا کہ شریعت کے سوا کوئی دوسرا علم نہیں۔ جو توجہ کے قابل ہو۔ بلکہ اس کی اہمیت خود قرآن حکیم میں موجود ہے۔ اور اسکے سوا شریعت کا چارہ بے جان نظر آتا ہے۔

یہ عام طور پر کہا جاتا ہے۔ کہ صرف ایک بیعت اسلام ہے۔ اور اس کے سوا کوئی دوسری بیعت نہیں۔ یہ بھی غلط ہے۔ بیعت اسلام کے سوا بیعت الرضواں کئی۔ جو خود قرآن حکیم کے اندر موجود ہے۔ اس کے علاوہ اقتدا اور اطاعت کی بیعت تو اسلام کے تو اتر میں چلی آتی ہے۔ اور کسی زمانے میں اس کا انکار نہیں کیا گیا۔ یہ ایک معاہدہ ہے جیسے عام معاہدہ کو جب تک ظاہری لباس نہ دیا جائے۔ بختہ تصور نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح یہ اسلامی یا طریقی معاہدہ بھی ہاتھ میں ہاتھ دینے کے سوا بختہ تصور نہیں کیا جاتا۔ اور ایک گونہ سنت ہے۔ ورنہ جب دلی اقرار ہو جاوے۔ اور پیر اُسے قبول کر لیں۔ تو بیعت ہو گئی۔ اور جب طبیعت کا نبھاؤ نہ رہے۔ تو سب ختم۔

رُشْد

یہ ایک ایسا لفظ ہے۔ جسے نہ تو علم سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور نہ علم سے باہر۔ مفسرین نے مختلف الفاظ سے اس کی تعبیر کی ہے۔ کامیابی کی راہ۔ بھلائی حقیقت حال۔ قصہ زیر نظر میں حقیقت حال زیادہ موندوں ہے۔ کیونکہ زبانی تو کچھ سیکھا نہیں جائے گا۔

بلکہ عملاً جو کچھ کیا گیا۔ جو حضرت موسے کے فہم میں نہ آیا۔ کیونکہ عقل کے فہم سے بالاتر تھا۔ اور ظاہراً بڑا۔ لیکن جب آخر کار حقیقت حال کھول دیا گیا۔ تو حضرت موسے کی تسلی ہو گئی۔ اور اس حقیقت کو پا گئے۔ کہ ظاہر سے بڑھ کر ایک اور حقیقت بھی ہوتی ہے جسے ہر ایک پا نہیں سکتا۔ خصوصاً مولیٰ کریم کی حکمتیں اور مصلحتیں عقول انسانی اور فہم اور اکی سے بالاتر ہیں۔ اور یہ فہم و اور اکی جسے دیکھ دیکھ سے دوسرے کا اس میں حصہ نہیں

طریقہ کے مجاہدے

طریقہ کے مجاہدے اور ریاضتیں اسی ارشد کے حاصل کرنے کے لئے پیرو مرشد کی رہنمائی سے کی جاتی ہیں۔ اور پیرو مرشد کے انوار عکسی اور مجاہدہ ریاضت کے انوار سے وہ مشاہدات سامنے آجاتے ہیں۔ جن سے بہت سی باتیں کھل جاتی ہیں۔ جن کے کھلنے سے اسلام کی نوری صورت سامنے آجاتی ہے۔ اور عقلی و حکوسلوں سے خلاصی ہو جاتی ہے۔ اور اس دنیاٹھے فانی کے مقابلہ میں آخرت کا پہلو زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ ہر قدم منزل کے پانے کے لئے زیادہ مضبوط اور زیادہ تیز ہو جاتا ہے۔

مجاہدے ریاضتیں نبیوں کی سنت اور طریقہ ہے

یہ خیال نہ کیا جائے۔ کہ یہ جو کیا نہ مجاہدے اور ریاضتیں ہیں۔ جیسے عام طور پر کہا جاتا ہے۔ خود قرآن حکیم پر جیسے اسوۂ حسنہ کا موطا لعمہ فرمائیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایسی باتیں جاگنا۔ ذات بھر عبادت میں گزارنا۔ پیٹ سے بھوکا

رہنا۔ روزے متواتر رکھنا۔ صوفیائے اسلام نے کوئی طریقہ ایسا تجویز نہیں کیا۔ جس کی بنیاد قرآن حکیم اور اسوۂ حسنہ سے نہ لی گئی ہو۔ صحابہ کرام کے حالات پڑھیے۔ وہ رات کو کھڑے ہوئے گزارتے تھے۔ اور آنسوؤں سے چہرے تر ہوتے تھے۔ سجدے اتنے لمبے ہو جاتے تھے کہ ایک حصہ رات کا گذر جاتا۔ اور سر نہ اٹھاتے تھے۔ آج کون سورہ بقرہ نماز میں پڑھ سکتا ہے۔ یا سن سکتا ہے۔ لیکن لاکھوں بندگانِ خدا نے ایک بہت بڑا حصہ قرآن کا پڑھنا اپنے معمول میں کر رکھتے گزارا۔ علمائے کرام کا یہ ذوق تو ضرور ہے۔ کہ علم قرآنی کے تدوین و ترمیم میں گزارتے ہیں۔ وہ بھی بڑی عبادت ہے لیکن دونوں کے کیف اور تاج الگ الگ۔ ایک کا واسطہ قلب سے ہے۔ اور دوسرے کا واسطہ عقل سے۔ قلب نور محمدی کا جلوہ گاہ ہے۔ اَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ لیکن عقل کو یہ رتبہ کہاں نصیب وہ اپنی عقلی زنجیروں میں جکڑے ہوئے۔ اُسے نہ تو تلاشی ہوتی ہے۔ اور نہ منزل مقصود پر پہنچنا جلدی سے ہو سکتا ہے۔

قَالَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا حضرت نے حضرت موسیٰ کی طبعی حقیقت ان سے واضح کر دی۔ کہ آپ میرے ساتھ صبر سے چل نہیں سکتے۔ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا بھلا کیسے صبر کرو گے اس چیز پر جو تمہاری درحقیقت اور سمجھ سے باہر ہے۔ یہ کتنی واضح حقیقت فطری

رَسَالِيهِمْ فَسَمِعَ كَذِبًا لَهُ وَاذْكُرْ أَسْمَاءَ بَكْرَةَ وَأَصِيلَةَ وَمِنَ الْبَنَاتِ فَمَا سَجَدَ لَهُ وَسَبَّحَهُ لَيْلًا طَوِيلًا ثُمَّ مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْفَهُ
کیوں نازل ہوا اس لئے کہ مجاہد سے ہیں زیادہ تکلیف اٹھاتے تھے۔ ۱۲۔

ظاہر فرمائی۔ اور سلتھ ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتنا بھانپ گئے۔ یہ تھقیٰ رشد
یا کرامتِ حضرت خضریٰ۔ بہر صورت بڑا وہ کچھ جو آپ نے فرمایا۔
لیکن موسیٰ علیہ السلام نے فرمادیا **مَسْجِدُنِيْ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ صَابِرًا**
وَلَا اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا بڑی عزیمت سے عرض کیا۔ کہ یقیناً آپ مجھے صابر
پائیں گے۔ اور کسی امر میں نافرمانی نہ کروں گا۔ لیکن اس پر پھر حضرت خضر بول اُٹھے۔
قَالَ فَاِنْ اَتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْئَلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰى اُحْدِثَ لَكَ
مِنْهُ ذِكْرًا کیا مزے کے سوالات جو بات ہو رہے ہیں۔ ہاں اگر تابعداری
اختیار کرتے ہو۔ تو مجھ سے کچھ نہ پوچھنا جب تک کہ میں خود اسے بیان نہ کروں۔

طریقت کا معاہدہ

کیا طریقت کا معاہدہ ہی نہیں ہوتا؟ تا بعداری کرو۔ حکم مانو لیکن کچھ نہ پوچھو۔
اگر سالک اس پر قائم رہتا ہے۔ تو کامیاب مرید ہوتا ہے لیکن اگر استواری قائم
نہیں رہتی۔ تو پھر اسے پیر واگزار کر دیتا ہے۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام کو **هٰذَا**
فِرَاقٌ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ کہہ کر جدا کر دیا گیا۔

تمثیلی حکایت

حضرت لئی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خادم آپسگو وضو کر لیا کرتے تھے۔ اور ایک
مدت سے حضرت کی خدمت میں مقیم تھے۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ کہ وہ اپنے
وقت کے لئے بہت اب رہتی ہے۔ لیکن فقرا جب کسی کو طریقت کے منازل سے گزرنے

کا خیال فرماتے ہیں۔ اور سالک اس پر چلنا شروع ہو جاتا ہے۔ تو سالک ایک بار دنیاوی حلاوتوں سے الگ ہو جاتا ہے۔ اور ذات ربی کے سوا اس کا کچھ مقصود نہیں رہتا۔ لیکن نفسی خیال سر اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس خادم نے کسی اپنے خیال سے ذکر کیا۔ کہ اگر میری شادی فلاں سے ہو جائے۔ تو بڑی اچھی بات ہوگی۔ اس لئے موقع پر حضرت کی خدمت میں عرض کیا۔ کہ آپ کے خادم کی خواہش ہے کہ اس کا نکاح ہو جاوے۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں! کس سے چاہتا ہے عرض کیا فلاں خادمہ سے۔ آپ خاموش ہو گئے۔ اور کوئی جواب نہ دیا۔ صبح بعد نماز جب حلقہ سے آپ فارغ ہوئے تو فرمایا دو مضبوط آدمی انھیں آؤ۔ چنانچہ حکم پاتے ہی دو خادم حاضر ہو گئے۔ اس خادم کا نام لے کر فرمایا۔ کہ اس کے کان پکڑ کر لے کر شریف کی حد سے باہر چھوڑ آؤ۔ چنانچہ خادموں نے کان پکڑ لئے۔ اور اس کو لے گئے۔ بعد میں آپ نے فرمایا۔ کہ کوئی اس کی سفارش میرے پاس نہ کرے۔

لیکن جب دو چار سال گذر گئے۔ تو اس بچارے کے حال پر کسی دوست اور رفیق کو رجم آیا۔ اور اس نے موقع پر حلقہ کے بعد عرض کیا۔ کہ حضور کا خادم نہایت خستہ حال ہے۔ اور بچان مارا مارا پھرتا ہے۔ آپ رجم فرمائیں۔ آپ نے فوراً کہا۔ کہ میں نے یہ نہیں کہا تھا۔ کہ اس کی کوئی سفارش نہ کرے۔ میری اس کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں۔ لیکن جب آٹھ سال میں عورت کا خیال میں اس کے ذہن سے نکال نہیں سکا۔ تو مجھے نکالنا مشکل ہے۔ میں نے خیال کیا۔ کہ اب زیادہ وقت اس کا ضائع نہ کیا جاوے۔ ورنہ مجھے اس سے عیبت ہے۔ دشمنی نہیں رہے۔

یہاں بھی حضور علیہ السلام کا ہذا فِرَاقِ بَيْنِي وَبَيْنِكَ کہنے کی

وہی ہی ہے۔ کہ اکٹھے گذرنی مشکل ہے۔ اور جو مقصود تھا۔ وہ بھی حاصل ہو گیا تھا۔ جیسے آئندہ بیان ہوگا۔

سید پیراں صاحب بھیروی ایک اسی قسم کے بزرگ تھے۔ اور عام سفر پر جاتے تھے۔ اور جہاں کہیں گزر جاتا تھا۔ لوگ دعا کے لئے عرض کر دیتے تھے۔ سبب یہ ہے کہ فوراً دعا دیتے۔ اور حاجت ایسی ہوتی۔ کہ صدیوں بعد بھی اپنا اثر ابھی تک قائم چلا آتا ہے۔ خود ہمارے گاؤں بیریل میں جب آئے۔ تو لوگوں نے درخواست کی۔ کہ آپ ہمارے اتفاق کے لئے دعا کیجئے۔ کیونکہ اکثر ڈھاک کے لوگوں کے ساتھ ایک حد زمین ہونے کی وجہ سے مقابلہ رہتا تھا۔ آپ نے کہا۔ کہ ڈھول منگاؤ۔ لیکن اس وقت کوئی ڈھول بیسرنہ ہو سکا فرمایا۔ تمہارا اتفاق مشکل ہے۔ چنانچہ ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ ان کا اتفاق نہیں ہو سکا۔ اور وہ ڈھاک والے ان پر غالب رہے۔

ڈھاک پٹن کے ملاحوں نے عرض کیا۔ کہ ہمارے پٹن کے لئے دعا کیجئے۔ فرمایا سلامتی ہی سلامتی ہے چنانچہ آج تک کبھی کوئی کشتی یہاں نہیں اُلٹی۔ اور نہ کبھی کوئی اس دنیا میں غرق ہوا ہے۔ ایسی بے شمار کرامتیں ان کی مشہور ہیں۔ اور آج تک لوگ ان کے عقیدہ مند ہیں۔ قبر صاحب برکت ہے۔ حضرت قبلہ میاں صاحب تشریف لائے جب مزار سے اٹھے تو فرمایا۔ مردہ بادشاہی کر رہا ہے۔ اور واقعی ہے بھی ایسے ہی چڑھاوے آج ملحد اور عقلمند دنیا میں بھی ویسے ہی ہیں۔ جیسے پہلے تھے۔ جب جاؤں اللہ اللہ کرنے لگتا ہے۔ اور دنیا سے بیزاری شروع ہو جاتی ہے۔

معاہدہ کے بعد سفر

معاہدہ طریقت ہونے کے بعد دونوں بزرگوار اکٹھے چلتے ہیں۔ تاکہ تعلیم و رشد کے اسباق دیئے جاویں۔ فقر میں جو بھی سبق ہوتا ہے۔ زبانی نہیں ہوتا۔ بلکہ عملی اسباق ہوتے ہیں۔ اور ہر عمل میں مترشد کے لئے سبق ہوتا ہے۔

فَانْصَلَقْنَا فَصَحَّشِي إِذَا رَكِبْنَا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا مَا قَالَ
اِخْرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتُكَ شَيْبًا إِمْرًا ۝ وَنُوجِبُ
جہل نکلے تو ایک کشتی پر سوار ہو گئے۔ اور جڑھتے ہی حضرت خضر سے پہچاننے لگے۔ مونس علیہ السلام نے جب یہ دیکھا۔ تو بے اختیار بول اٹھے۔ کیوں بھائی اس لئے بھاڑتے ہو کہ اس کے سوار غرق ہو جاویں۔ یعنی ہم لوگ۔ تو نے ایک بھاری کام کر رکھا ہے۔

کہتے ہیں۔ کہ جب یہ دونوں بزرگ تشریف لائے۔ تو کشتی والوں نے خضر کو پہچان لیا۔ کیونکہ اس بزرگ صورت سے لوگ آشنا تھے۔ ایسے تکوینی بزرگ اگرچہ عام طور پر مشہور نہیں ہوتے۔ اور نہ کوئی خاص مسند پر تشریف فرما ہوتے ہیں۔ اور اکثر سفر میں رہتے ہیں۔ لیکن موقعہ بموقعہ ان کے کرامات خود بخود ظاہر ہو پکڑتے رہتے ہیں۔ جس سے ان کی شہرت عام ہو جاتی ہے۔ چونکہ کرامات کا اثر عقول پر غالب آجانے کے لئے دلوں پر زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے دنیا میں ایسے لوگوں کی تعظیم و تکریم ہوتی چلی آئی ہے۔ یہ اس کے فضل ہیں۔ کہ ایک تو اپنے خاص بندوں کی عزت بڑھانے ہیں۔ دوسرا اس ذریعہ سے عام و خاص

ان کا نشان مل جاتا ہے۔ اور لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

حضری صورت

حضرت خضر کو کسی نے دیکھا تو نہیں لیکن ان کے اس قصے اور دیگر روایات کی وجہ سے ان کے خصائل اور عادات ان کے چہرے پر اتنے واضح و آشکارا نظر آتے ہیں کہ جب کوئی نیک صورت فرشتہ حقیقت انسان سامنے آتا ہے تو لوگ بے اختیار کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو حضری صورت بزرگ ہیں۔ سو یہ حضری صورت کا ہی اثر تھا کہ کشتی بانوں نے بغیر کرایہ ان کو سوار کر لیا اور پھر جب وہ کشتی بھاڑ رہے تھے۔ تو کسی کشتیبان نے واویلا نہ کیا۔ بلکہ جیسے عام ہوتا چلا آیا ہے۔ کہ میاں فقیروں کے کام حکمت سے خالی نہیں ہوتے ہیں۔ یہاں بھی مولیٰ علیہ السلام کے سوا کسی نے شور اور واویلا نہ کیا۔ بلکہ حق تو ان کے لئے چھینا چلانا پہلے تھا۔ مگر یہاں ایک تو طبع جلالی تھی۔ دوسرے منصب نبوت کے مالک بھی تھے۔ گو کتنے اقرار کئے تھے۔ کہ نہ بولوں گا۔ اور کتنے وعدے کئے تھے۔ کہ میں صبر سے چکے رہوں گا۔ لیکن جب آپ نے خیال شریعت کے الٹ دیکھا۔ تو پکار اٹھے۔ لَقَدْ جِئْتُ شَيْئًا مَّرًّا۔ تم بڑی بھاری بات کر چکے ہو۔ ایک طرف موسوی فضیلت ہے لیکن دوسری طرف استادی سبقت میں ناکامی ہے۔ اور وہی بات سچی ہو چکی۔ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا۔ تم اس بات پر کیسے صبر کر و گے جس کو تمہاری سمجھ نہ پاسکے گی۔ یعنی تمہاری سمجھ سے باہر ہوگی۔ چنانچہ عالم خضر نے وہی کہہ دیا۔ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ہ مونس علیہ السلام

کو اپنا وعدہ یاد آگیا اور اپنی بھول چوک کی معافی چاہی۔ اور کہہ دیا۔ قَالَ لَا تَوَاخِذُنِي
 بِمَا نَسِيتُ وَلَا تُرْهِقْنِي مِنْ أَمْرِي عَسْرًا ۖ ذَا بِمَا نَسِيتُ
 (میں بھول گیا ہوں) کو دیکھئے کتنے نرم الفاظ سے فرماتے ہیں۔ اور پھر لَا تُرْهِقْنِي
 مِنْ أَمْرِي عَسْرًا (میرے کام پر تنگی نہ کیجئے گا) کہہ کر اپنی معذرت نہایت
 فصیحانہ طریقہ سے پیش کر دی جس پر حضرت چپ ہو گئے۔ اور اپنا سفر شروع کر دیا۔

دوسرا سبق

فَانْطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا لَقِيَا غُلَامًا فَقَتَلَهُ ۖ قَالَ أَقْتَلْتِ
 نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ ۖ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا ثَكْرًا
 جب چلے۔ تو ایک لڑکا سامنے آگیا۔ اور۔۔۔ عالم خنز نے اسے قتل کر دیا پھر موسیٰ علیہ السلام
 بل اسٹھے۔ کہ ایک پاک جان کو بدلے بغیر تم نے قتل کر دیا۔ اب تو بہت بڑی مکروہ
 بات آپ نے کر ڈالی۔ پھر حضرت علیہ السلام نے وہی کلمہ دہرایا قَالَ الْوَأَقْلُ
 لَكَ إِثْمًا لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۖ هَذَا صَبْرًا لَكَ ۖ زِيَادَةٌ تَخْصِيصِ
 کے لئے بڑھا دیا۔ تاکہ خطاب میں زور پڑے۔

لیکن موسیٰ علیہ السلام نے ایک دوسری راہ معذرت لی۔ اور کہہ دیا۔
 قَالَ إِنْ سَأَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصَاحِبْنِي قَدْ بَلَغْتَ
 مِنْ لَدُنِّي عُذْرًا ۖ هَذَا صَبْرًا لَكَ ۖ زِيَادَةٌ تَخْصِيصِ
 خود ہی اپنے لئے فیصلہ کی راہ بھی تعین کر لی۔ کہ اس کے بعد مجھے الگ ہونے
 میں کوئی عذر نہ ہوگا۔

خود سوچئے۔ ایک نبی صاحب شریعت کس طرح ایسے مکروہ بلکہ حرام فعل پر نفاذ موش
 رہ سکتا تھا۔ لیکن مرشد کے سامنے دم بخود ہو گئے۔ جب انہوں نے وعدہ یاد دلایا اور خود
 بھی تاڑ گئے۔ کہ میں ایسی تعلیم کے لئے اس عالم کے پاس بھی گیا ہوں۔ چنانچہ حضرت
 خضر کے بجائے موسیٰ علیہ السلام کو کرنی پڑی۔

تیسرا سبق

فَانْطَلَقَا فَهَضَحْتُ إِذَا آتَيْتَا أَهْلَ قَرْيَةٍ اسْتَطَعَا أَهْلُهَا
 فَأَبَوْا أَنْ يُضَيِّفُوهُمَا فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ أَنْ
 يَنْقُضَ فَأَقَامَهُ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا
 چلے اور گاؤں میں پہنچے۔ اور ان سے کھانا طلب کیا۔ لیکن وہ مہمان داری سے انکار کر گئے
 اتنے میں ایک دیوار گرتے دیکھی۔ تو حضرت خضر نے ہاتھ یا سر دے کر سیدھی کر دی۔
 لیکن موسیٰ علیہ السلام کو ان پر غصہ تھا۔ کہ انہوں نے ہمیں پانی تک نہیں دیا۔ یہ خضر نے
 کیوں ان سے بھلائی کی۔ تو کہہ دیا۔ کہ تم مزدوری لے سکتے تھے۔ یعنی کچھ لے کر کھانا
 کھاتے۔ بے مروتوں سے مروت کیسی۔

بے صبری پر بے صبری

جب تینوں موقع پر حضرت موسیٰ اپنے وعدے پر پورے نہ نکلے۔ اور
 خود ہی فیصلہ بھی دے چکے تھے۔ تو خضر نے فرما دیا۔ قَالَ هَذَا فِرَاقُ
 بَيْنِي وَبَيْنَكَ وَسَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ

صَبْرًا کہ تمہارے اور میرے درمیان یہ جدائی ہو چکی لیکن تمہیں حقیقتِ حال سے خبر داکرتا ہوں۔ جس پر تم سبر نہ کر سکتے۔

ایک طرف تشریح ہے۔ اور دوسری طرف تکوین۔ ایک صاحب نبوت میں۔ اور دوسرے صاحب ولایت۔ ایک کا علم ظاہر سے ہے۔ دوسرے کا علم باطن سے۔ ایک جسم ہے۔ اور دوسرا جان۔ گفتگو آپ پڑھ چکے۔ علم لدنی کے کوششے دیکھ چکے۔ اور علم ظاہری کی بے صبری ملاحظہ ہو چکی۔ لیکن اس کے باوجود نبی نبی ہے۔ اور ولی ولی۔ رعایا کا کوئی فرد اپنے علم میں دس گنا بھی زیادہ بادشاہ سے ہو تو پھر بھی حکم بادشاہ کا ہوگا۔ اور رعایا کا فرد محکوم۔ نہ اس سے نبوت میں خلل آتا ہے نہ اس سے ولایت کے درجہ کے علم کو کم کرنے کا طریقہ سوچنا پڑتا ہے۔ لیکن تکوین کے اندر کس درجہ کا علم ہے۔ اور کس درجہ کا یقین اور تشریح جب کبھی یقین حاصل کرتی ہے۔ تو تکوین کے مشاہدات سے۔ اور ذات الہیہ کے ذاتی انعکاس سے۔ صفات خواہ کتنی بلند ہوں۔ پھر صفات ہیں۔ ذات الہی کے صفات ذات سے جدا نہیں۔ لیکن پھر بھی ذات تو نہیں ہو سکتے قرآن حکیم میں سر مائے ہیں وَ كَذَٰلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوَقِّنِينَ ۝ ایسے ہی ہم نے حضرت ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے اقدار حقیقی دکھائے تاکہ وہ یقین کرنے والوں سے ہو جاوے۔ تمام انبیاء کو پہلے مشاہدات وحی موقعہ موقعہ دکھائے جاتے ہیں جن سے یقین بلند ہوتا جاتا ہے۔ اور مہر نبی کی فضیلت کا درجہ اسی یقین توحید پر ہوتا ہے۔ خود قرآن حکیم فرماتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَضَّلْنَا بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ مِّنْكُمْ

اللَّهُ وَرَفَعَهُ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ ط وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ
 الْبَيْتَ وَآيَاتِنَا بِرُوحِ الْقُدُسِ ط یہ پیغمبر بزرگی دی ہم نے بعض ان
 کے کو اوپر بعض کے۔ ان میں سے بعض وہ ہیں۔ کہ باتیں کی اللہ نے اور بلند کیا
 بعض ان کے کو درجوں میں اور دی ہم نے عیسیٰ بیٹے مریم کو دیلیلیں ظاہر۔ اور
 قوت دی ہم نے اس کو ساتھ جان پاک کے۔ دیکھئے موسیٰ کریم موسیٰ علیہ السلام
 سے عیسیٰ علیہ السلام کے مدارج بلند دکھانے کے لئے ”وَآتَيْنَا عِيسَى
 ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيْتَ وَآيَاتِنَا بِرُوحِ الْقُدُسِ ط“ بڑھا کر عیسیٰ علیہ السلام
 کو کتنا بلند فرما دیا۔ کیوں اسی نسبت تکوینی کی وجہ سے۔ اور اسی تیقن کی وجہ
 سے موسیٰ کریم سے پکے پکے کھانے طلب کرتے ہیں۔ اور وہ آسمان سے
 اترتے ہیں۔ کیوں اترتے ہیں۔ صرف ان کے اس تیقن سے کہ وہ ایسے کر سکتا
 ہے۔ دوسرے انبیاء کا اعتقاد بھی تو یہی تھا۔ لیکن اتنی بچسکی نہ تھی۔ اور جسے تیقن
 حاصل ہو گیا۔ وہ اپنے تیقن کے مطابق اس ذات اقدس سے حاصل کر سکتا
 ہے۔ حضرت موسیٰ کی قوم کے لئے من وسلویٰ عنایت ہوا۔ لیکن وہ ویسے
 ہی بے صبر رہے۔ اور مسور مانگنے لگے۔ بے صبری ناشکری ہے۔ یہی وجہ
 ان کی آوارگی کو بڑھانے والی ہوئی۔ کہ تیقن کم تھا۔ ورنہ حکم پر قریب میں داخل
 ہو جاتے۔ تو آوارگی ختم تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جو درجہ تشریح میں ہے۔ اس سے تمام قرآن
 حکیم بھرا پڑا ہے۔ موقعہ بموقعہ ان کے ذکر سے امت محمدیہ کی ہدایت اور رہبری
 کے لئے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ اور حق بھی یہ ہے۔ کہ فرعون جیسے سرکش

انسان جو خدائی دعویٰ کئے بیٹھا تھا۔ موسے جیسے نبی کی شان تھی۔ کہ اس کے مقابلہ کے لئے ڈٹ گئے۔ بنی اسرائیل جیسی قوم کو ذلت اور مسکنت سے اٹھا کر عزت و سلطنت پر جا کر بٹھا دیا۔ اور تمام عمر جہاد میں گزار دی۔ ان کا ایک ایک واقعہ دنیا کے لئے ہدایت و رشد کی شمع ہے۔ لیکن دیکھئے آیتہ تفضیل میں کس جنت و بلاغت سے عیسے علیہ السلام کا تفضل اور بزرگی و عظمت ظاہر کی گئی۔ اور "وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُّسِ" ہم نے اس کی امداد روح القدس سے کی کے الفاظ سے کتنا بلند فرما دیا گیا۔ کیوں صرف تکوینی نسبت کی وجہ سے پیدا ہوئے تو تکوینی طریقہ سے بن باپ۔ اٹھائے گئے تو تکوینی ذریعہ سے۔ کہ یہود صلیب پر لٹکا رہے ہیں۔ اور وہ آسمان پر جا پہنچے۔ زندگی میں بھی اسی مناسبت سے اندھوں کو بینا کرتے رہے۔ مردوں کو زندہ کر کے دکھاتے رہے۔ جٹیکہ مٹی کے جانور میں اپنی روح پھونک کر اسے اڑا دیا۔ لیکن تشریحی نسبت بہت کمزور تھی۔ اس وجہ سے قرآن حکیم میں بہت مختصر ذکر ان کا آیا۔ اور آیا بھی تو وہ بھی یہی کچھ کہ ایسے پیدا ہوئے۔ ایسے اٹھائے گئے۔ ایسے کھانے طلب کئے۔ اور ایسے ہم نے دئے۔ اور ایسے جانور بنائے۔ اور مردے زندے ہو گئے لیکن موسے کی قوم باوجود سمجھ کچھ دیکھنے کے بعد بھی گویا سالہ دیکھڑا، پوجنے لگ گئی۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبَكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَابَةِ أَوْ
أَنْتُمْ قَسْوَةٌ لِأَنْتُمْ كَسْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَابَةِ أَوْ

۱۰ فیض روح القدس از باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچه میجائے کرد

میں زیادہ سخت ہو چکے) کا ارشاد ان کے بارے قرآن حکیم میں موجود ہے۔ بخلاف ان عیسائیوں کے۔ فرماتے ہیں۔ وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ - وہ سنتے ہیں جو انزال ہے رسول کی طرف، نو دیکھتا ہے۔ کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی جگہ عیسوی امت کی نرم دلی کا ذکر قرآن حکیم میں موجود ہے۔ آخر کیوں مشہور ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ موسوی نسبت اپنا رنگ دکھاتی ہے اور عیسوی اپنا اثر دکھائے بغیر کیسے رہ سکتی ہے لیکن آپ دیکھتے ہیں۔ کہ یہ دونوں نسبتیں آپس میں دست و گریباں بھی رہتی ہیں۔ اور ایک دوسرے کے بغیر ان کا زندہ رہنا بھو محال ہے۔

اسلام ان دونوں نسبتوں کو متوازی طریقے سے اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اور ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مجمع البحرین ہے۔ کسی نسبت کو کسی دوسری پر فوقیت نہیں۔ اور یہی اسلام کی ایک ممتاز صفت دیگر مذاہب سے الگ ہے۔ کہ کسی دوسرے مذہب میں یہ اجتماع ضدید نہیں۔

توحیدی آب حیات ایک ہے تو الب کی وجہ رنگ بولگ لگ ہے

توحید ایک ایسا پیرستہ ہے جس نے اس چشم سے جتنی سیرابی حاصل کی۔ اسی درجہ سے

لَهُ وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً
 (پک حیدر) اور کی ہم نے ان لوگوں کے دلوں میں جو پیروی کرتے تھے
 اس کی رحمت اور مہربانی۔ ۱۲

بقا نصیب ہوا۔ مذاہب کا یہ سوشمہ ایک ہے۔ لیکن جیسے زمین کا پانی ایک ہے لیکن مختلف انواع کی زمینوں میں پانی کا ذائقہ پانی کا رنگ و بو الگ الگ ہے۔ اسی طرح توحید ایک ہے۔ لیکن مختلف قوالب کے اندر جب یہ نمودار ہوتی ہے۔ تو قوالب کے اثرات اس کے اندر آجاتے ہیں۔ اور ہر توحید اپنے قالب کے رنگ و بو سے الگ الگ نظر آتی ہے۔ دیکھتے نہیں کہ زمین کا پانی کہیں بہت ہی شیریں اور صاف ہوتا ہے۔ اور کہیں وہی پانی نمکین اور جلاب آور ہو جاتا ہے۔ اور کہیں جا کر وہ مٹی کے تیل میں ڈھل جاتا ہے۔ جسکی بو دماغ کو بھاڑتی ہے۔ ایسے ہی جب قلب عمدہ ہو تو توحید نہایت صاف ستھری صورت میں نمودار ہوتی ہے لیکن جہاں قلب گھٹیا ہو۔ اور اعلیٰ درجہ کا نہ ہو۔ تو اسلام کی توحید بھی وہی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اور بعض جگہ تو مٹی کے تیل کی طرح سخت بو دار ہو جاتی ہے لیکن جیسے تیل بے کار نہیں۔ ایسے ہی وہ توحید بھی بے کار نہیں۔ جو معاشرہ انسانی کے قلوب کے لئے آب حیات ہونے کا کام نہیں دیتی۔ بلکہ روشنی اور ایندھن جیسے کام میں آتی ہے۔ ایسے ہی انسانی معاشرہ کے دوسرے معاملات میں روشنی کا کام دیتی ہے مشہور ہے۔ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ کسی نبی و مرسل کی اصل نسبت معلوم کرنے کے لئے اس کی امت پر نظر کی جاوے۔ اور کسی ولی کی ولایت کے لئے اس کے مریدین کو دیکھا جاوے جو اثر مریدوں پر ہے۔ وہ اصل کی حقیقت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام ایک مشرب توحید رکھتے ہیں۔ لیکن اپنے اپنے طبعی زمین کے اثرات سے توحید می آب حیات دونوں کا الگ الگ صاف نظر آ رہا ہے۔ اسی وجہ سے

لشون میں مشرب موسومی اور مشرب عیسوی دونوں کے حقائق الگ الگ دکھائے جاتے ہیں۔ اور نسبت محمدی کو ایک الگ مقام بلند دیا جاتا ہے۔ کیونکہ سید نسبت بلند "آب زلال کی مثال ہے۔ اس کا پانی لب سے زیادہ شیریں اور خوش مضم ہے اور رنگ دبوٹے بے مثال۔ دیکھنے میں خوبصورت۔ سونگے میں خوشبودار۔ اور کھانے میں خوش ذائقہ۔ اور نتائج صحت میں معاشرہ کے اندر یہ مثال اسلئے فرمایا گیا۔ ع ا آخر آمد بود فخر الاولیں

ع آنچه خوباں ہمہ دارند تو تنها داری

اس لئے توحید محمدی کا درجہ تمام توحیدی اوریان سے بلند ہے اور ہر توحید اس کے سامنے سرنگوں ہے۔ اور اسی وجہ سے الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ تمام بنی نوع کو مخاطب فرما کر کہا گیا۔ اور حق بھی یہ ہے۔ کہ جو اس توحید کے اندر داخل ہوا اور اس کے المراد و غوامض سے واقف ہوا۔ وہ اس یقین پر پہنچ گیا۔ کہ جو کچھ ہے نسبت محمدی ہی محمدی ہے۔ اور باقی اظلال ہیں۔

اب پھر اصل قصہ کی طرف چلیں۔ کہ جس کی تمننے بے صبیری کی وہ نہیں میں تبادوں۔ تاکہ تمہیں اصل رشد کا پتہ چلے۔ جس کی تعلیم کے لئے میری طرف آپ کو بھیجا گیا تھا هَذَا فِرَاقٌ بَيْنِي وَبَيْنِكَ کا فیصلہ تو ہو چکا تھا۔ لیکن مرشد کے لئے یہ بھی تو ضروری تھا۔ کہ اپنے ظاہری نامناسب اعمال کی حقیقت بھی تو کھول دے۔ تاکہ اپنے مزید کا دل تھلی پکڑ جائے۔ کہ واقعی میں حقیقت حسان تک نہیں پہنچا اور میری بے صبیری بے معنی تھی۔

چنانچہ کہہ دیا گیا۔ سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ

عَلَيْهِ صَبْرًا هَسْ بِرَعْم صَبْرًا كَرَسْكَ اَسْ كِ حَقِيْقَتِ اَصْلِيَهْ بِشِشْ كَرُوْتِيَا هَسْ
 چنانچہ حضرت علیہ السلام نے "تاویل" یعنی حقیقتِ حال پیش کر دی۔ فرمایا:۔
 اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسْكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَارَدَتْ
 اَنْ اَعْيَبَهَا وَكَانَ وِرَاثَهُمْ مَّلِكٌ يَّاخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ
 عَصَبًا هَسْ يَشْتِيْ مَسْكِيْنَ غَرِيْبُوْنَ كِي تَقِيْ۔ جو دریا میں اپنا کاروبار کرتے تھے تو میں
 نے اسے عیب ناک کر دیا۔ کیونکہ بادشاہ ہر شتی کو پیچھے بیگار میں پکڑے آتا
 تھا۔ تاکہ وہ عیب دار ہونے کی وجہ سے اسے نہ پکڑے۔ اور یہ غریب اپنا
 کاروبار کرتے رہیں۔

اب یہ سوچیے گا۔ کہ یہ فعل مذموم تھا۔ یا محمود۔ کہ مسکینوں کی کشتی بیگار میں
 نہ پکڑی جائے

وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَهُ مُؤْمِنِيْنَ فَخَشِيْنَا اَنْ يُّرَهَقَهُمَا
 طَغْيَانًا وَكُفْرًا هَسْ فَارَدْنَا اَنْ يُّبَدِلَهُمَا رَبَّهُمَا خَيْرًا وَسَنَّهُ
 زَكَاةً وَاقْرَبَ رَحْمًا هَسْ ہاں۔ غلام کے ماں باپ مومن تھے پس ڈر
 پیدا ہو گیا۔ کہ وہ لڑکا کفر اور سرکشی سے ان کو کہیں ذلیل نہ کر دے۔ تو ہم نے چاہا
 کہ ان کا رب ان کے لئے اس سے بھلائی مستحالی اور محبت و لگاؤ والی اولاد
 بدل دے۔

وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامِيْنَ يَتِيْمِيْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ
 تَحْتَهُ كَنْزٌ لَهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَاحِبًا فَآرَادَ رَبُّكَ اَنْ
 يُّغْلِبَ أَشَدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَهُمَا كَنْزَهُمَا نَحْمَةً مِّنْ رَبِّكَ هَسْ

وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ۗ ذَٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ
صَبْرًا ۗ ديار دوستیم بچوں کی اس شہر میں تھی۔ اور اس کے تیلے ان کے لئے
پہلے بنیاد میں مال نقدی رکھا ہوا تھا۔ اور ان کے ماں باپ بڑے صالح تھے۔
تو تیرے رب نے چاہا۔ کہ وہ جوان ہو کر تیرے رب کے فضل و کرم سے وہ خزانہ
پالیں۔ لیکن یہ جو کچھ میں نے کیا اپنے خیال سے نہیں کیا بلکہ رب کے حکم سے یہ بیان
ہے۔ ان چیزوں کا جس پر تم ممبر نہ کر سکتے۔

قرآن حکیم کی بلاغت و فصاحت سے تو کفار کو بھی انکار نہ تھا۔ لیکن کسی مقام پر بھی
آیات قرآنی پر غور کیا جاوے۔ تو بے اختیار منہ سے نکلتا ہے۔

۴ ہزار نکتہ باریک ترمذی مو این جا است

ان آیات پر ہی غور فرمایا جائے۔ کس فصیحانہ اور بلیغانہ طریقہ سے واقعات اور سوال و
جواب کو اپنی معجز بیانی سے ادا فرمایا۔ کچھ ارشادات پیش کئے جلتے ہیں۔

سب سے پہلے غور فرمایا جاوے۔ کہ منصبدار نبوت حضرت موسیٰ علیہ السلام
کے اعتراض اصل حقیقت موسوی کو کیسے اظہار کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

أَخْرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا بِمَا عَصَيْتَ رَبَّكَ فَكَانَ يُبَدِّلُ الْوَجْهَ لِمَا يُرِيدُ لَقَدْ جِئْتَ
غَرَقَ ہوجا دیں۔ پھر اس پر غصہ کا اظہار فرمایا۔ اور فرمایا کہ تم انوکھی بات کر گئے۔ لیکن رانندہ
ولایت اس کے مقابل جو بیان دیتے ہیں۔ تو کتنے ٹھنڈے دل سے۔ فَأَرَدْتُ

أَنْ أَعْيِبَهَا وَكَانَ وَرَأَاهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا

لیوں۔ صرف اس لئے کہ کشتی مسکینوں کی تھی۔ اور اپنی روٹی اس کے ذریعہ دیریا

ہر کماتے تھے۔ اور بادشاہ ہر کشتی کو بیکار میں بکڑے آتا تھا۔ ایسے ہی جب فرمایا۔ اَقْتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ ۗ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا مُّسْكِرًا۔ تو نے ایک پاک جان کو بلا بدلہ قتل کر دیا۔ تو نے ایک نامعقول چیز کر دی۔ چونکہ پہلا معاملہ کم تھا۔ اس لئے ”شَيْئًا اَصْرًا“ کہا۔ اب بہت بھاری معاملہ قتل کا کر دیا۔ تو صاف کہہ دیا ”شَيْئًا مُّسْكِرًا“، لیکن رازدار محبت کا جواب سُنَّيْءٌ۔ غلام رچھے کو کہیں قتل کیا۔ اس لئے فَكَانَ اَبَوَا مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا اَنْ يُّرْهَقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا کہ ہمیں تو اس کے کفر و سرکشی کا خوف تھا۔ کہ ہمیں اس کی حیات زندگی سے اس کے ماں باپ ذلیل نہ ہوں۔

یہ وہ نونو فعل ظاہر ابر سے تھے۔ اور ناجائز۔ اس پر تبنا و ادیلا حضرت موسیٰ کے توجی تھا۔ لیکن مہمانی نہ ملنے پر ناراض ہونا۔ ایک نیک کام کرنے پر یہ کہہ دینا لَوْ شِئْتُمْ لَتَعَزَّزْتُمْ عَلَيْهِ اجْرًا۔ اگر تم چاہتے تو اجر لے سکتے تھے۔ گو موسیٰ علیہ السلام نبی ہی ہوں۔ دل میں کھٹکتا ہے۔ کم و بیش موسیٰ علیہ السلام کو اس موقع پر تو خاموشی اختیار کرنی تھی۔ لیکن صاحب شریعت نبی کو مہمانی نہ ملنے پر سنج ہوا۔ اور جلی طور پر آپ فرما گئے مگر وہ رے ولایت۔ رونی کھانے کو اہل میہ دیتے نہیں۔ لیکن بھلائی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

پھر موسیٰ جو کچھ فرماتے ہیں۔ اپنے بشری تقاضا سے فرماتے ہیں۔ لیکن خضر جو کچھ کرتے ہیں۔ اپنے ارادے سے نہیں کرتے۔ بلکہ بغیر جھجک کہہ دیتے ہیں۔ کہ اے منصب دار نبوت تم گھبرا گئے۔ میں نے تو کوئی کام بھی اپنے ارادے

سے نہیں کیا۔ آپ کیوں معترض ہوئے۔ اگر موسیٰ علیہ السلام بھی ذرا سی توجہ فرمالتے۔ تو غالباً یہ عقده پیدا نہ ہوتا۔ یعنی موسیٰ کریم کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا لیتے۔ لیکن مولا کریم کو سبق دلانے منظور تھے۔ کہ موسیٰ! گو تم اپنی جگہ منصبِ نبوت ہو۔ لیکن ایک رازدار ولایت کے ساتھ بھی اس معاملہ میں مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تمہارا منصب اور۔ اس کی رازداری یا علم اور۔ دنیا میں حکم آپ کا۔ اور آپ امت کے مالک۔ لیکن باطن کا معاملہ کچھ اور ہے۔ کچھ ایسے بندے بھی میری چادر کپڑائی میں ہیں۔ جو کوئی ایک امر بھی میری خواہش و ارادے کے بغیر نہیں کرتے۔ اور ہر کام میرے ارادے کے ماتحت کرتے ہیں۔

اسیے اب آیات پر دوبارہ غور فرمائیے۔ اور خطوط کشیدہ افسانہ کا مطالعہ فرمائیے۔ پہلے واقعہ کے جواب میں ”فَاَرَادَتْ اَنْ اَعْيَبَهَا“ میں ارادت کی نسبت اپنی ذات کی طرف فرمائی۔ دوسرے واقعہ قتل میں اپنی ذات کے ساتھ ایک اور کو بھی شامل فرماتے ہیں۔ ”فَخَشِيْنَا اور فَاَمْرُدْنَا“ فرما کر ذاتِ اقدس کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ تیسرے واقعہ میں جہاں موسیٰ کو ایک نیک کام پر بھی اعتراض ہے۔ فعل کی نسبت صرف ذاتِ خداوندی کی طرف فرما کر ان کی توجہ پر ایک کاری ضرب لگاتے ہیں اور فرماتے ہیں ”فَاَرَادَتْ اَنْ اَعْيَبَهَا“ اور پھر رچی رچی بھی لفظ نہیں فرمایا۔ بلکہ رب کی نسبت ان کی ذات کی طرف پیر دی۔ تاکہ ان کے دل پر زیادہ موثر ثابت ہو۔ کہ کتنی بے صبری ہوتی۔ جب خود میرا رب یہ ہی چاہے۔ تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن اَرَادَتْ۔ اَرَادْنَا۔ اَرَادَ۔ ایک نہیں۔ بلکہ ہر واقعہ میں الگ

نسبتوں سے فاعلیت کو ایک کر دیا۔ اور کھلا واضح فرما دیا کہ اللہ کا بندہ خود کچھ نہیں ہوتا۔ اگر فعل کو اپنی طرف منسوب کرے تو۔ اور اگر اپنے آپ کو مولے کریم کے ساتھ شریک کرے تو۔ اور اگر اپنے فعل کو اٹھا کر صرف ذات اقدس کی طرف نسبت کرے تو۔ نہ شرک ہے۔ نہ کفر۔ بلکہ عین اظہار عبودیت کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اخیر میں تمام فعل نسبتوں پر ایک ایسی ہر لگائی جس میں کسی شک کی گنجائش نہ ہے۔ فرمایا وَمَا فَعَلْتُمْ عَنْ أَصْرِي۔ اب غور کیا جاوے۔ تو نہ کشتی میں وہ ناعل حقیقی تھے۔ نہ قتل میں۔ بلکہ حکم کے تابع ایک بندہ مومن تھا۔ جو ہر حکم کی تعمیل کے لئے بلا چون و چرا تیار ہے۔ لیکن اس کے سامنے تمام افعال کے مقاصد و عراض کو بھی پہلے ہی سامنے کر دیا گیا۔ تاکہ اسے تر و نہ ہو۔

اکثر دیکھا گیا ہے۔ کہ اس حقیقت و لایت کے سامنے نہ رکھنے سے بعض اہل علم اعتراض و اعتراض کرتے جاتے ہیں۔ اور کسی ایسے فعل کو جسکی نسبت فاعل حقیقت میں ہے، اپنی طرف منسوب کرنے سے شرک سے تعبیر فرماتے ہیں۔ لیکن اگر قرآن حکیم کے ایسے مواقع کو مطالعہ فرمایا جائے۔ تو یہ اعتراض اور یہ شرک کا واہمہ تمام خود بخود دور ہو جاتا ہے۔

فَادِدْنَا أَنْ يَبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِنْهُ زَكَاةً وَأَقْرَبَ رَحْمَةً كَمَا هُوَ كَمَا صَافٍ تَلَاتَا هُوَ۔ کہ اللہ کہے بندے بعض تقدیروں کو بپٹ دیتے ہیں۔ اور بپٹ سکتے ہیں۔ کتنے صاف الفاظ میں کہتے ہیں۔ ہم نے ارادہ کر لیا۔ کہ ان کا رہنے اس سے اچھے حال اور بہتری کو تبدیل فرما دیں۔ اقبال رح کا کہنا

درست ہے۔ ۶

نگاہِ مردِ مومن سے پلٹ جاتی ہیں تقدیریں

کیا قرآن حکیم سے ہی یہ نتیجہ پیدا نہیں کیا گیا۔ اور پھر جسے اس راہ میں کچھ بھی تعلق ہے۔ وہ جانتا ہے۔ کہ اللہ اپنے بندے کی کیسے سنتا ہے۔ اور کیسے قبولیت دیتا ہے۔ اَدْعُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ بھی یہ خبر دیتا ہے لیکن یہاں ارادہ ازلی ارادہ بندے کے ساتھ ایک ہو رہا ہے۔ اس لئے اَرَدْنَا کہہ دیا۔ درنہ یہاں جمع متکلم کی جگہ صرف اپنا آپ ہی پیش کرنا ہے۔

غرض۔ دونوں میں سے ایک بات ضرور تسلیم کرنی پڑے گی۔ کہ یا تو یہی بات ہے۔ کہ ارادہ ازلی۔ ارادہ بندہ مومن کے ساتھ چلتا ہے۔ یا یہ کہ خود ذات اقدس بندے کے اندر بول رہی ہے۔ جیسے اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ جَمْع کی صورت میں زبانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ادا فرمایا گیا لیکن اولیٰ ہی ہے کہ پہلے ”اَرَدْنَا“ ہیں حضرتِ نضر کو شامل کیا جاوے۔ کیونکہ دوسری بار پھر فرماتے ہیں۔ اَنْ يُّبَدِلَهُمَا رَبُّهُمَا۔ کہ پہلی اپنی ارادت پر دوسری تبدیلی رب سے چاہتے ہیں۔

مجاویب الہی کو اکثر دیکھا۔ کہ متکلم بصورت جمع بات کرتے ہیں۔ اور اس میں ذاتِ خود کا تصور نہیں کرتے۔ بلکہ جب نسبتِ ذاتی سے کوئی بات کرنی ہوتی ہے تو اپنے نام کو پیش کرتے ہیں۔ مثلاً جلدی ایسے کرتا ہے۔ ایسے کہتا ہے۔ لیکن عام گفتگو کا انداز گفتگو جمع متکلم ہوتا ہے۔ جس کے اندر اپنے آپ کو شامل نہیں کرتے۔ مثال کے

۱۰ سائیں بندی ایک مجذوب صاحب باطن فقیر تھے۔

طور پر میں اپنا ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔

جب میں ملازم تھا۔ اور میرے والد قبلہ رحمۃ اللہ علیہ وفات پانگئے۔ تو بعض معتقدین محبت مجھے مجبور کرتے تھے۔ کہ ملازمت ترک کر کے گھر کا کام کج اپنے باپ دادا کا سنبھال لوں۔ یعنی خانقاہیت کی بوریائیں اختیار کروں لیکن میرے اندر اخباری دنیا بستی تھی۔ مجھے خانقاہیت کے ٹکڑے پسند نہ تھے۔ جیسے عام قومیت ہوتی ہے۔ کہ یہ مفت کھاتے ہیں۔

اس زمانے چند مجذوب بزرگوں کی شہرت تھی۔ ایک سائیں گوراندتا تھے۔ جو تحصیل پھالیہ کے ایک گاؤں ٹھٹھ عالیہ میں رہا کرتے تھے۔ ویسے تو نام کے ہندو تھے۔ لیکن ہندوؤں سے بڑھ کر مسلمان نائین ان کے پاس جاتے تھے۔ میرے ایک دوست کا گزر بھی وہاں پر اکثر ہوتا تھا۔ اور اکثر ان کے پاس جاتے تھے۔ اور کچھ نہ کچھ ان کی باتیں سن کر آتے تھے۔ اکثر ان کا ذکر میرے پاس بھی ہوتا تھا۔ مجھے بھی ایام رخصت میں وہاں سے گزرنا تھا۔ میں بھی ان کی خدمت میں چلا گیا۔ اور بیٹھ گیا لاؤ خیال وہی تھا۔ کہ خانقاہیت کا ٹکڑا ذلیل ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے۔ گوراں دنہ! کچھ تو نے دیا کچھ میں نے دیا۔ مل کر روٹی پک گئی۔ کچھ تو نے کھائی کچھ گوراندتہ نے تو پھر ایسے ویسے کا گوراں دتہ پر کیا احسان۔ اس نے اپنا کھایا گوراں دتہ نے اپنا کھایا۔ اس کے بعد یہ خیال بھی تھا کہ میری کیا قیمت ہے۔ جب میرے بزرگ اور میرے چچا موجود ہیں۔ اور خاص کر برادر کرم مولانا فخر الدین صاحب جو حضرت میردی رحمۃ اللہ علیہ کی بیعت کے بعد ایک اچھے صوفی صافی ہو چکے ہیں۔ اور عبادت و ذکر فکر میں یکساں درجہ بلند رکھتے ہیں۔ اور میں ہوں پُر از خطا۔ نہ دین سے مس۔ نہ ذکر و فکر سے تعلق۔ تو اس کے جواب میں

سائیں صاحب نے کہا جانا کہ بڑھ چوتھی ہے۔ شاخیں نہیں بھڑکتیں اس پر دونوں باتوں کا حل میرے سامنے آ گیا لیکن دنیا وار کب ماننا تھا۔ کہ کسی چھوڑ کر چٹائی پر بیٹھ جاؤں اور کبھی بڑھی دنیا سے الگ ہو کر جاہل دنیا میں بسیر اختیار کر لوں۔

لیکن قدرت خدا مولائے کریم مجھے آہستہ آہستہ خود بخود جذب فرماتے گئے اور ملازمت کے بدلنے کے لئے پشاور چھوڑ دیا۔ اور گھر آ کر بیٹھ گیا۔ کہ آج جانا ہوں۔ کل جانا ہوں۔ جتنی کہ کسی کوزہ و مصلے کا ہو رہا۔ جس سے نفرت تھی اور وہی کچھ سامنے آ رہا جو سائیں گوراندہ نے کہا تھا۔ اور وہ بات بھی نکل گئی۔ کہ ہم کسی کا کھاتے ہیں۔ گو کھاتے لوگوں کا ہیں لیکن خیال یہی ہے۔ کہ ہم کھلاتے ہیں لیکن کسی کے باپ کا نہیں۔ خدائے قدوس کے فضل و کرم کا دسترخوان ہے۔ خود کھاتے اور لوگوں کو کھلاتے ہیں

غرض بہت سے ایسے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں اکثر یہی دیکھا۔ کہ جب یہ لوگ کجا جمع ہوتے ہیں تو منشا الہی سے بول رہے ہوتے ہیں اور جب ذاتی بات آجائے تو اپنے نام کی نسبت دیکر کہتے ہیں۔ اگر حضرت بھی ایسی نسبت سے "آردنا" بول گئے ہوں۔ تو کیا عجب۔ منصب اربوت کے امیدوار کو اپنی قوم کے بندے نے ڈھائی دی۔ جبکہ دوسری قوم کا آدمی اس پر غالب ہو رہا تھا۔ ان کو قومیت کے جوش نے ابھارا۔ اور ایک ایسا لگہ مارا کہ وہ وہیں مر گیا۔ اس کا مرنا تھا کہ بے اختیار عاجزی اور حضور ہی میں فرمانے لگے **هَذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِينٌ** کہ یہ شیطانی کام ہو چکا۔ کیونکہ وہ ایک دشمن انسان اور گمراہ کندہ ظاہر ہے! اور ساتھ ہی بارگاہِ غفور الرحیم سے اپنے گناہ کی معافی کے لئے عرض کیا۔ **رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ**۔ اس استغفار سے مولیٰ کریم نے معافی فرمائی۔ اور **فَعَفَّرَ لَهٗ طَائِفَةٌ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِیْمُ** اس نے بخشش فرمادی کیونکہ وہ بخشنے والا رحیم ہے۔ **اَللّٰهُ جَوَانِعَامٌ** مجھ پر فرمائے اس کی وجہ سے میں کبھی کسی مجرم کا مددگار نہ بنوں گا۔

لیکن راز دارانہ قدس کو دیکھئے۔ کہ وہ ایک نوجوان کو قتل کرتا ہے۔ جس کا کوئی قصور نہ ہو۔ اور کوئی وجہ اس کے قتل بلکہ دھمکانے کی بھی نہیں آتی۔ تو ایسے بے گناہ کو

بکرے کی طرح ذبح کر دیتے ہیں۔ ذرا سی پریشانی نہیں آتی۔ کہ میں نے ایک بے گناہ کو قتل کر دیا۔ بلکہ جب موسیٰ علیہ السلام نے کہا بھی۔ کہ ایک پاک جان کو بلا قصاص تم نے مار دیا۔ اور تو نے بڑی نامعقول بات کر دی۔ تو اس کے بجائے کہ ان کو زدامت ہوتی پریشانی ہوتی۔ لٹاکتے ہیں کہ میں نے تمہیں نہ کہا تھا کہ تم میرے کاموں پر صبر نہیں کر سکتے۔ اور برابر خاموش چلے جاتے ہیں۔ نہ لوگوں کا ڈر نہ اس کے ماں باپ کا خوف نہ ادھر بھاگتے ہیں نہ ادھر۔ نہ کوئی پوچھنے والا۔ بخلاف حضرت موسیٰ کے کہ خوف کھاتے ہیں اور بھاگتے ہیں۔ اتنے میں ایک آدمی بھاگا آتا ہے۔ اور مشورہ دیتا ہے۔ کہ تجھے قتل کرنے کے مشورے ہو رہے ہیں۔ تو بھاگ جا۔ تو موسیٰ بھاگتے ہیں۔ اور ساتھ دعا کرتے جاتے ہیں۔ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (یا اللہ مجھے ظالموں سے خلاصی دے)

لیکن یہاں بھاگنا نہیں۔ بلکہ حسب معمول اپنے کام میں وہ چلتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ قصہ دیوار پیش آتا ہے اور اپنے کام کر چکنے کے بعد نہایت بے باکی کے ساتھ اپنی کارکناری ایک مصلحت عامہ و خاصہ الہی سے پیش کرتے ہیں۔ اور صاف کہہ دیتے ہیں۔ کہ جن کاموں کو تو نے بڑا سمجھا وہ اہل میں بڑے چھوڑ دے۔ اور پھر میں نے اپنے ارادے تو کئے ہی نہیں۔ بلکہ ارادہ ازلی کے ماتحت جو کچھ کیا، کیا۔ کاش آپ سمجھتے۔

کشتیوں کی بیگار۔ بچہ نوجوان کا بد فعل ہونا۔ اور دیوار کے نیچے خزانے کے ہونے کا پتہ کیسے راز دار قدس کو معلوم ہوا۔ نہ تو وحی کا سامان ہے۔ نہ کشف کی صورت ہے۔ نہ قیادہ ہے۔ آخر یہ کیا ہے۔ یہ وہی "علم لدنی" جس کی تعلیم کے لئے موسیٰ علیہ السلام کو چند سبق دلانے منظور تھے۔

اسے غیب دانی کہا جائے تو کیا بڑائی۔ بلکہ میں تو کہوں گا۔ غیب دانی کا کتنا بھی اس موقع پر معیوب ہے۔ اسے علم لدنی سے ہی تعبیر کیا جائے تو ٹھیک ہے۔ ارادہ ازلی جب کسی کے سامنے ہو۔ تو اسکے لئے کیسے الفاظ تعبیر کئے جاویں۔ آج یہ بحث عام ہے۔ کہ غیب سے کسی کو کچھ حصہ ملا ہے یا نہیں۔ بعض کلیتہً منکر ہیں بعض کلیتہً قائل بظن یہ ہے کہ علمائے کرام غیب کی کچھ ایسی تعریف کرتے ہیں۔ کہ تمام ایسی پوشیدہ باتیں جو کسی کے مشاہدہ میں نہ آتی ہوں۔

اور وہ کوئی تباہی نہ تو اس کو غیب نہیں گردانتے بلکہ کشف و کرامت و الفا و غیرہ سے تعبیر
 کر لیتے ہیں لیکن طبقہ عام ہر اس چیز کو جو آنکھوں کے سامنے نہ ہو اس کو غیب سے تعبیر کرتے ہیں۔
 اور ہر غیر شاہدہ کے بیان کرنے والے کو غیب ان کہہ دیتے ہیں۔ ورنہ جیسے آیات سے
 دیکھا گیا ہے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ کہ تمام افعال کی علت کسی کے سامنے نہ تھی خود حضرت
 موسیٰ جیسے اولوالعزم ان سے بے خبر تھے۔ تو ایسے اشیاء کے ظاہر کرنے سے حضری علم کو
 کس سے تعبیر کیا جاوے۔ آخر یہی غیب سے تعبیر کریں گے۔ اور حقیقتاً ہے بھی غیب جو آپسے
 بتا کر موسیٰ علیہ السلام جیسی پاک ہستی کو اپنے سامنے گردن جھکانے پر مجبور کر دیا۔ بہر صورت
 اصطلاحات کی وجہ سے جھگڑا ہے۔

میری تحریر سے کسی کو یہ شبہ پیدا نہ ہو جاوے۔ کہ حضرت خضر حضرت موسیٰ علیہ السلام
 سے قرب خداوندی میں بہت بلند درجے رکھتے تھے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام
 باوجود ایک نبی ہونے کے اس درجہ پر نہ پہنچے جس درجہ پر حضرت خضر تھے۔
 بے شک تقرب کی وجہ سے حضرت خضر کو جو علوم نصیب ہوئے۔ وہ حضرت موسیٰ
 کو نصیب نہ ہوئے۔ کیونکہ صاحب تقرب کو تقرب کی وجہ سے ایک گونہ تمام معاملات اور
 رازائے سر بستہ سے انعکاسی صورت دل کے اندر پیدا ہو جاتی ہے لیکن منصبدار
 خلافت سے اسے کیا نسبت۔ یہ پوری امت کا مالک ہوتا ہے۔ اور اپنی امت کا
 سربراہ۔ اس کے تمام احکام واجب التعمیل۔ اور اس کی شریعت حق پر ایمان لانا ہر ایک امتی
 کا فرض۔ اس کی دعوت عامہ کو جو ٹھکرائے۔ وہ کافر کہلاتا ہے۔ بخلاف رازدار الفت کے۔
 کہ وہ دعوت عمومی چھوڑ خصوصاً دعوت کا بھی مالک نہیں۔ وہ جانتا ہے لیکن حکم کے سوا
 ایک قدم اٹھا نہیں سکتا۔ اور وہ ایک امتی کی طرح اپنے آپ کو اپنے رسول کا ایک
 امتی خیال کرتا ہے۔ اور اپنے آپ کو اس کا مقلد عمومی خیال کرتا ہے۔ وہ اسے نائب
 خدا سمجھتا ہوا۔ اس کی شریعت کا علم دار ہوتا ہے۔ اس کی توضیحی مثال ایسی ہے جیسے
 گورنر جنرل کا سیکرٹری خصوصی۔ جسے پرائیویٹ سیکرٹری یا پرنسپل اسسٹنٹ سے تعبیر کرتے
 ہیں۔ کہ وہ گورنر جنرل سے جو تعلق حاضری رکھتا ہے۔ اور واقفیت خاصہ۔ اس کی

براہری گورنر صوبہ نہیں رکھتا لیکن منصب اور عزت اقتدار کے لحاظ سے گورنر ایک صوبہ کا واحد قہار مالک ہوتا ہے۔ بخلاف سکریٹری کے کہ اسے کوئی حق اس قسم کا نہیں ہوتا۔ اُسے گورنر جنرل کی منشی گیری کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ایسے ہی ایک دوست گورنر جنرل کی دوستی کی وجہ سے علاقہ کے تمام راز ہائے سرسبز سے واقف بھی ہو جائے۔ اور بعض واقفیت میں گورنروں سے بڑھا بھی ہو لیکن مملکت سے اسے کچھ اقتدار نہیں۔ اور نہ ہی کوئی اس کے سوا جانتا ہے۔ کہ اسے دوستی کی نسبت اس سے ہے۔ اور اس نسبت سے وہ کچھ کرا سکتا ہے۔ جو دوسرے بعض منصب دار حکومت نہیں کرا سکتے لیکن منصب دار خلافت خلیفۃ اللہی ہوتا ہے۔ اور تمام امت کا سربراہ ہوتا ہے۔ اور وہ صرف اپنی ذات واحد سے تعلق کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اگر سب اپنی مرضی سے بھی کرائے۔ پھر بھی حکم گورنر جنرل کا ہوگا۔ تو اسے باطن سے تعلق محدود نصیب ہے گا۔

اس لئے کسی صورت میں بھی حضرت مومنہ علیہ السلام سے حضرت خضر کو فوقیت نہیں۔ ہاں۔ وہ تقرب جو ایک در دولت پر حاضر رہنے والے کو نصیب ہوتا ہے وہ ایک گورنر کو نصیب نہیں ہوتا۔ خواہ کتنے ہی اقتدار اور نیابت کا مالک کیوں ہی نہ ہو۔ حضرت محمد و علیہ الرحمۃ نے اپنے مکتوبات میں اس حقیقت کو خاص واضح فرمایا۔ صاحب فکر اس کو مطالع فرمائیوں۔

ثُمَّ أَجْعَلِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ

نوٹ:۔ ہر صفحہ کے عنوانات کے ذریعے زیر عنوان عقیدت کی توضیح
مطلوب ہے۔ عنوانات کی تجدید کے مضمون کے تسلسل
کوئی فرق ذہن میں نہیں آنا چاہئے۔

شریعت اور طریقت کا فرق

ثُمَّ أَجْعَلِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ - آیات قرآنی پر نظر دوبارہ سے بارہ
ڈالئے۔ کیا یہ صاف روشن نہیں ہو گیا۔ کہ شریعت اور طریقت اور
شریعت کو اگر ظاہری علل و اسباب کے ساتھ تعلق ہے۔ تو طریقت کو باطنی سررشتہ
کے ساتھ وابستگی ہے۔ ایک کا تعلق عالم خلق کے ساتھ ہے۔ اور دوسرے کا
جوڑ عالم امر کے ساتھ۔

طریقت بلند استعداد لوگوں کے لئے ہے

بے شک شریعت اول ہے۔ اور طریقت بعد۔ یہ بھی نہیں کہ شریعت
کی طرح طریقت کی راہ پر ہر انسان کے لئے چلنا ضروری ہو۔ یہ استعدادی بحالہ
ہے۔ جن کی استعداد شریعت سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ان کے لئے حباد
طریقت میں قدم رکھنا ضروری نہیں بلکہ یہ اپنے اختیار کی بات نہیں۔ جیسے شریعت
اپنے اختیار سے تعلق رکھتی ہے۔
۔۔ اس علیحدگی میں مخالف نہیں

طریقیت کے لئے عقیقت ضروری ہے

یہ صرف مومبتِ عظمیٰ ہے۔ جو نیک سیرت انسانوں میں سے کسی کے حصّہ میں آتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے۔ کہ حلال و حرام کی تمیز رکھنے والوں کے لئے ہی بیہودت ہے۔ گنہگار انسانوں کے لئے یہ دروازہ نہیں کھلتا۔ اور بہرگز نہیں کھلتا۔

طریقیت باطنی مشاہدے کا دوام ہے

طریقیت کیلئے ہے؛ وہی جسے علمِ لدنی سے تعبیر فرمایا گیا۔ اور جو ظاہر سے نکل کر باطن میں قدم رکھتی ہو۔ جس کا تزکیہ صرف ظاہری نہ ہو بلکہ باطنی ہو جو ہر چہینہ کا سرشت اپنے مشاہدہ سے خدائے ذوالجلال سے جڑا ہوا دیکھے۔ جس کے ہر خیال میں خدائے قدوس کے روشن انوار نظر آویں۔

صاحبِ طریقیت کو کیسا ہونا چاہیے

اس کی کوئی گھڑی بھی مَازِاعِ الْبَصَرِ وَمَا ظَفَعِ کے مطابق ادھر ادھر نہ پھرے۔ ایک ہو اور صرف ایک۔ تمام جہان اس کے لئے ایک واہمہ سے بڑھ کر حقیقت نہ رکھتا ہو۔ اور دنیا کی ہر حقیقت کو حقیقت جانتا ہو اور سراسر بَسْمَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بِأَطْلَاهِ کا اور زبانِ حال سے چلتا ہو۔ اور اپنے پرانے سے نگاہ اٹھ جائے۔ "خیر محض" دنیا کو سمجھے اور دنیا کے تمام امور کیا سفلی کیا علوی۔ تمام کی حقیقت ایک جانے۔ اور قدرتِ الہی کا کرشمہ۔

چون و چرا کی گنجائش اپنے دل میں نہ پائے۔

صاحبِ شریعت کے تاثرات

موسے علیہ السلام شریعت کے منصبدار۔ اور توراہ جیسی مقدس کتاب کے مالک۔ اور ایک امت کے مقتدا ہونے کے باوجود اکثر خدائی کاموں پر اپنے بشری اور فطری تقاضے سے معترض ہو جاتے تھے۔ اور صرف اعتراض نہ ہوتا بلکہ اعتراض سے بڑھ کر بارگاہِ الہیہ میں بے ادبی بھی کر بیٹھتے تھے۔ یہاں تک کہ گناہوں کی معافی کے لئے جب ستر آدمیوں کو پیش کیا گیا۔ اور بھلی ان کو کھا گئی۔ تو کھلے الفاظ سے مخاطب ہوئے۔ اَتَهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا۔ کیا بے وقوفوں کے افعال پر ہمیں ہلاک کرنا ہے؟ اِنْ هَدَاكَ فِتْنَتُكَ۔ یہ بھی تیری ہی آزمائش ہے۔ ایسے ایک بار نہیں۔ بلکہ کئی مواقع پیش آئے۔ جس پر آپ ایسے بے باکانہ کلمے بے اختیار منہ سے نکالتے رہے۔ چونکہ مولیٰ کریم دلوں سے واقف تھے۔ اور اخلاصِ موسوی کو دیکھتے تھے۔ اس لئے ان کی اس بے ادبی پر ناراضگی نہ فرمائی۔ بلکہ ان کو ایک اور قدم بڑھانے کے لئے حضرت کی خدمت میں بھیج دیا۔ خود بھی تعلیم فرما سکتے تھے لیکن ایک غیر کے مشاہدے اور علم سے جو بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ وہ بلا تکلف اور بلا تردد حاصل ہونے سے نہیں ہوتی۔

شریعتِ حقہ کی حرفِ اطاعت کا سامان

صاحبِ علم صاحبِ تقویٰ اب بھی بعض امورِ تکوینی پر معترض ہوں۔ تو ان کا حق ہے۔

کیونکہ ان کی آنکھیں اس معرفت تک نہیں پہنچی ہوتیں۔ جو انہیں اس اعتراض سے بچائے اور تمام کارخانہ الہیہ کو حق جانے۔ یہ بھی ایک فضل ہے۔ درجہ شریعت کا کون پاسبان ہوتا۔ یہ دولتِ پاسبانی انہیں علمائے شریعت سے ہوں ہی ہے کہ ہر ایک امر شریعت پر سر و سر کی بازی لگا رکھی ہے۔

علمائے شریعتہ موسوی مشرب ہیں

یہ لوگ موسوی مشرب زیادہ ہوتے ہیں۔ اور مولانا کریم نے جب ان سے یہی کام لینا منظور کیا ہے۔ تو کیوں ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھایا جاوے اور کیوں ان کو نرم گفتار اور نرم مزاج بنا کر شریعتِ الہیہ کی تذلیل کرائی جاوے۔ جیسا پہلے لکھا گیا ہے۔ طریقت کے لئے ذلیل اعداد، مستعد نفوس کی ضرورت ہے۔ اور شریعتِ غبرا کے لئے زیادہ (تعداد میں) پاک نفوس کی ضرورت ہے۔ یعنی عوام ان کو دعوت ہے۔ یہ معاملہ ظاہری ہے۔ اس ظاہر کے لئے بہت تنگ و دو کی ضرورت ہے۔ اور وہ معاملہ باطنی وہ کبھی کبھی دنیا میں پیش آتا ہے جس کی رہبری کیلئے کسی صاحبِ علم لدنی کی ضرورت ہوتی ہے۔

اہل طریقت بھی اکثر اہل شریعت ہیں

موجودہ وقت میں جو عوام طور پر طریقت کی طرف عوام و خواص دوڑتے ہیں وہ اصل میں طریقت کی طرف متوجہ ہو کر نہیں دوڑتے۔ بلکہ وہ شریعتِ الہیہ کے مختلف

۱۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا۔ اَللّٰهُ لَمْ يَجْعَلْ يَسْبِقِ الْيَقِيْنَ

کرنے اور اس پر عمل میں راسخ ہونے کے لئے جاتے ہیں۔ کیونکہ علمائے شریعت نے اپنے لئے صرف حدودِ البقیہ کی نگہبانی تک اپنا نظریہ محدود کر لیا ہے اور شریعت پر چلنے اور چلانے کے لئے تزکیہ نفس کو جو اصل راس المال شریعت تھا چھوڑ دیا گیا۔ وہ خیال فرماتے ہیں کہ شریعت پہلے ہے۔ اور تزکیہ بعد۔

تزکیہ نفس مقدم ہے

لیکن جہاں تک قرآن حکیم کا نظریہ ہے۔ وہاں پہلے تزکیہ بعد علم شریعت ہے۔
 يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ طَرِيقًا (آیت اور سورہ مجید) رسول ان پر اللہ کی آیتیں پڑھتا ہے ان کا تزکیہ فرماتا ہے (یعنی ان کو سنواتا ہے) اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔

تزکیہ نفس کی طرف سے بے توجہی

لیکن ہمارے ہاں معاملہ الٹ گیا ہے۔ کتاب (کلام اللہ) و حکمت (یعنی حدیث) میں تو زندگیاں ختم کر دی جاتی ہیں۔ اور اس کے حصول کے لئے ملک کی مسافرتیں طے کی جاتی ہیں۔ اور تزکیہ نفس کے لئے کوشش کرنا تو کجا خود تزکیہ نفس (یعنی سفورنے) کو ایک بے فائدہ چیز خیال کیا جاتا ہے اور تزکیہ کے لئے قدم اٹھانا ناجائز سمجھا جاتا ہے

نجات کا مدار تزکیہ پر ہے

حالانکہ وار و مدارِ فلاح تزکیہ پر ہے۔ قَسْدًا أَفْسَحًا مِّنْ زَكَاةٍ

وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّهَا (واشمس) قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى وَذَكَرَ
 اسرارِہٖ فصلے (اعلیٰ) فلاح علم پر موقوف نہیں بلکہ تزکیہ پر ہے۔
 ایسی صورت میں شریعت الہیہ کے احکام کی تابعداری اور اطاعت کے لئے
 جب سامانِ تمیاز ہو۔ تو لامحالہ اس پاک جذبہ کے حاصل کرنے کے لئے صاحب
 تزکیہ یعنی صاحبِ طریقت کی طرف جانا فطراناً پیدا ہو جانا ہے۔

تزکیہ نفس صاحبِ تزکیہ کا فن ہے

اور چونکہ صاحبِ طریقت اس دولتِ تزکیہ سے مالا مال ہوتا ہے۔ وہ اپنی ایک
 نگہ سے ہی یہ دولتِ دلوں کے اندر جمادیتا ہے۔ درحقیقت یہ خدمتِ علمائے
 شریعت کے لئے ہمواری راہ کی مثال پر ہے لیکن علمائے کرام ان کو اپنا مقابل
 خیال کرتے ہوئے ان کو گرانے کی فکر میں رہتے ہیں اور ان کے برعل پر بلا تڑو کفر و شرک
 کی آگ برسا کر ختم کرنا چاہتے ہیں۔

رقابتِ علم و عرفان میں غلط بینی ہے منبری کی

کہ یہ منصور کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا

ورنہ معاطہ سہل ہے نظر اپنی اپنی۔ اور کام اپنا اپنا کسی کے بیر سے کیا واسطہ۔

۱۔ ترجمہ: تحقیق نجات پا گیا جس نے نفس کو پاکیزہ بنایا اور نقصان میں رہا جس نے نفس کو گنہگار کیا۔

۲۔ ترجمہ: تحقیق نجات پا گیا جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا اور نماز پڑھی۔

۳۔ شریعت کی تابعداری بھی تزکیہ نفس کے بغیر نہیں ہو سکتی اس لئے صاحبِ عقل سلیم کو
 بہا تزکیہ نفس کی طرف توجہ ہوتی ہے۔

پارہ اول میں تزکیہ نفس کو مؤخر کیوں رکھا گیا

کسی کے ذہن میں یہ اعتراض پیدا نہ ہو کہ پارہ اول (آیتہ ۱۲۶) میں یہ الفاظ
 قرآن حکیم میں موجود ہیں۔ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَ
 يَعْلِمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ۔ یہاں تزکیہ بعد ہے اور
 تعلیم کتاب و حکمت اول ہے۔ تو جاننا چاہئے۔ یہ الفاظ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے
 ہیں۔ خود ذاتِ قدوس جل جلالہ کے یہ نہیں اور یَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُزَكِّيهِمْ
 اور وہ الفاظ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْاُمَمِيْنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُو
 عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُزَكِّيهِمْ خود ذاتِ قدوس جل جلالہ کے ہیں۔

پیغمبری تربیت میں تزکیہ کا درجہ اول ہے

اس لئے تربیت میں صحیح تعلیم رسالت ایسی ہی تھی۔ کہ آیاتِ الہیہ کے پڑھنے
 کے ساتھ تزکیہ کی طرف کامل توجہ رہتی تھی۔ اور اس کے بعد کتاب و حکمت
 کی تعلیم کا درجہ تھا۔

نفسانی امراض کا علاج تزکیہ کے سوا کیا ہو سکتا ہے

ایسی صورت میں علمائے ظاہر ان لاعلاج امراضِ قلبیہ کے دور کرنے کے لئے
 اپنے اندر کوئی خاص نہیں رکھتے اور ثانی دوا تجویز نہیں فرما سکتے۔ بیکبر۔ حسد۔ ریا۔ مکر اور نفاق

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ الْاٰیة

کا کیا علاج احکام سے ہو سکتا ہے۔ یہ اندرونی امراض احکام کی زد سے باہر ہیں۔ قتل و زنا کے لئے قصاص اور حد شرع ہے۔ لیکن تکبر و حسد کے لئے کیا حکم دیا جائے۔ اس کا علاج وہی شافی ہے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کا فرمایا اور وہ تھی آپ کی نظر مبارک۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندگی

تذکرہ نفسِ اسلام کے اجزائے ضروریہ سے ہے

اسلام خود حکمت و کتاب اور تزکیہ کے متوازی معجونِ مرکب سے تیار ہے۔ کوئی ایک جزو الگ ہو جانے سے اسلام اپنی صحیح اسلامی صورت میں نہیں رہتا۔ ایسے ہی قرآن حکیم بھی ایک بے مثل تریاق یا آبِ حیات ہے جس کے اندر تینوں اجزا برابر اکٹھے ہر آیت میں ملتے ہیں۔

طریقیتِ خدمتِ خلق ہے

سعدیؒ نے بھی طریقیت کی حقیقت اپنے الفاظ و خیال میں بیان کی ہے۔
طریقیت بجز خدمتِ خلق نیست تسبیح و سجادہ و دلق نیست
یعنی (خلقِ خدا کی خدمت کے سوا طریقیت کچھ اور نہیں۔ تسبیح و سجدے اور گودڑی سے نہیں بنتی) حقیقت جذبہ خدمت تھا جو لاکھوں انسانوں کی معرفت کا باعث ہوا۔ کہیں تو ایک گتے کو پانی پلانے سے ہی حجابات اندرونی اور بیرونی

اٹھ گئے۔ (غرض استعدادی معاملہ ہے) اور کہیں سالوں مجاہدہ کے بعد ایک پڑھ بھی نہیں اٹھا۔

رشد و ارشاد سے بڑھ کر کسی خدمتِ خلق ہے

ہاں عام جذبہ خدمت سے بزرگانِ طریقت معمور ہوتے ہیں۔ اور رشد و ارشاد خود کیا ہے؟ یہی خدمتِ خلق اس سے بڑھ کر اور کیا خدمت ہو سکتی ہے۔ کہ خلق خدا کو غلط راستے سے صحیح راستے پر قدمزن کر کے اس کو اندھیرے گھپ سے نکال کر نورِ الہی کی طرف پھیر دیا جائے

ذکرِ الہی ہی سالک کا اس المال ہے

لیکن قرآن حکیم اور بزرگانِ سلف رحمہم اللہ علیہم جمعین نے اس راہِ طریقت کے حصول کے لئے اور معرفتِ الہیہ کے لئے ذکر و فکر کو بڑا درجہ دیا ہے۔ قرآن حکیم میں جتنا زور ذکرِ الہی پر ہے۔ شاید کسی دوسرے عمل پر اتنا نہ ہوگا۔ کیونکہ مسلمان کا اس المالِ افضل الذکر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے اور اسی پر دار و مدار ایمان ہے۔ سروسٹ ہم چند آیات پیش کرتے ہیں۔

پارہ ۲۲ سورہ اعراب آیات ۴۱ - ۴۲ - ۴۳ -

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اذْكُرُوْا
اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا وَّسَبِّحُوْهُ
بِكُرَّةٍ وَّاصِيْلًا هُوَ الَّذِيْنَ
اے ایمان والو! یاد کرو اللہ کو
بہت یاد اور پاکی بولو سبح
و شام وہی ہے جو

يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُ لِيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ حَيِّمًا
 رحمتیں بھیجتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے
 کونکالے تم کو اندھیروں سے اُجالے میں۔
 اور ایمان والوں پر مہربان ہے۔

ذکر کثیر سے دل منور ہوتا ہے

ذکر کثیر یعنی بہت ذکر کرنے کا ارشاد ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی تسبیح و تہلیل پڑھنے کا۔ اس لئے کہ مومن کریم اور اس کے فرشتے ہر وقت تم پر اپنی طرف سے رحمتیں

اس جہن علم دوست حضرات اس ذکر سے کوئی دوسرا ذکر (صرف نماز) مراد لیتے ہیں اور اللہ شکر کرنے کو ایک فعلِ عبث قرآن پاک کے برخلاف جانتے ہیں۔ خود دھوکا کھائے ہوئے ہیں یا دوسروں کو فریب دیتے ہیں۔ اسم اللہ کے ذکر کرنے کے لئے کئی جگہ آیات بیانات حکمہ بلا تاویل موجود ہیں۔

۱) **وَادْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبْتَئِلْ اِلَيْهِ تَبْتِيلاً**۔ (مزل)
 اور اپنے رب کے نام کا ذکر کر اور اس کی طرف سب سے الگ ہو جا الگ ہو جانا

۲) **وَادْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصْبِلًا**۔ (الدھم)
 اور اپنے رب کے نام کا ذکر کر صبح اور شام۔

۳) **قَدْ افْتَحَ مِنْ تَزْكِيٍّ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلِّ** (اعلیٰ)
 بے شک نجات پا گیا وہ جو پاکیزہ ہو اور اپنے رب کے نام کا ذکر کیا اور نماز پڑھی۔

۴) **وَيَذْكُرُ فِيهَا اسْمَ اللّٰهِ كَثِيْرًا**۔ (حج) وغیرہ وغیرہ جاتا ہے۔
 اور ان میں اللہ کے نام کا ذکر بہت کیا

پھر ذکر کثیر کا لفظ خود بھی اتنا جامع مانع ہے۔ کہ کوئی دوسری چیز نماز وغیرہ اس شمار میں نہیں آسکتی۔ صرف ذکر کثیر۔ خود بتلاتا ہے۔ کہ اللہ اللہ کر نامراد ہے۔

بھیجتے ہیں۔ تاکہ تم اندھیروں سے نکل کر نور حق دیکھ پاؤ۔ غرض ذکر کثیر رحمتِ الہی اور اس کی پاک مخلوق نوری کی رحمتوں کا باعث ہوتا ہے۔

دل خواہشات سے نکل کر انوار میں داخل ہو تو یہی معرفتِ الہی ہے

اور جب رحمتِ الہی منواتر انسانی دل پر وارد ہوتی ہے۔ تو دل بشری ظلمات یعنی خواہشات نفسی کے اندھیروں سے نکل کر تجلیاتِ الہی کے انوار میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہی طریقت و معرفت ہے۔ اسلام صرف شرائع نہیں سکھاتا۔
شرائع کے ساتھ باطن کو انوار معرفت سے روشن کرنا چاہتا ہے۔

احکام شریعت معرفت کا پہلا قدم ہے

شریعت بے شک پہلا قدم معرفتِ الہیہ کا ہے۔ لیکن صرف شریعت کے احکام ظاہر یہ اس نور مطلق تک نہیں پہنچاتے۔ جب تک احکام سے بڑھ کر دل کی توجہ اس ذاتِ اقدس کی طرف نہ بڑھے۔ اور یہ حاصل ہوتی ہے۔ ذکر کثیر سے۔ جسے آج کی اسلامی دنیا ایک عبتِ فعل خیال کرتی ہے۔

سلاطین عالم ذکر کے نور کے سامنے جھک گئے

عام خیال یہ ہے۔ کہ الفاظ کی رٹ سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔ بے شک عام الفاظ کی رٹ سے کچھ حاصل نہ ہوتا ہوگا۔ لیکن اللہ کے نام کی رٹ کبھی کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ لاکھوں نہیں کروڑوں انسان صرف اسی رٹ سے خدائے قدوس کی

معرفت تک پہنچ گئے۔ تاریخ شاہد ہے۔ اور دنیا گواہ۔ سلاطین عالم ان کے سامنے
 جھکے۔ اور صرف مسلمان بادشاہ نہیں بلکہ غیر مسلم بھی ان کے سامنے سر جھکا گئے۔
 کیوں؟ خاکی پتے کے لئے یا اس نور مطلق کی روشنی کی وجہ سے جو اس خاکی پتے
 کے اندر ذکوہ وینج سے چمک اٹھی؟۔

۵ یاد اور سرمایہ ایماں بود ہر گدا از یاد او سلطان بود

موسیٰ علیہ السلام کو حضور علیہ السلام کے پاس کیوں جانا پڑا

بہر صورت جو یہ کہا جاتا ہے کہ احکام شریعت کے سوا حقیقت کچھ اور نہیں۔
 یہ آیات کھلے طور بتلاتی ہیں۔ کہ موسیٰ علیہ السلام خود شریعت کے مالک تھے۔
 پھر بھی ان کو حقیقت کی طرف قدم اٹھانے کے لئے حکم فرمایا گیا۔ اس لئے ہر اُس
 نفس پر جو اللہ تعالیٰ کے معارف دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے شریعت سے
 آگے ایک اور قدم بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اور اسی ضرورت کے لئے مولا
 کریم نے موسیٰ علیہ السلام کی توجہ کو اٹھایا۔

مرشد کی ضرورت

موسیٰ علیہ السلام خود خالق حقیقی سے کلام فرماتے تھے۔ خود صاحب کتاب
 تھے۔ الہام وحی سے تعلیم دلائی جاسکتی تھی لیکن ایسے نہیں کیا گیا۔ بلکہ خود انہیں
 جیسے انسان کو جسے اپنے علم حقیقی سے سرفراز فرمایا گیا تھا ان کی تربیت و حقیقت
 کے لئے منتخب فرمایا۔ پھر نام و نشان تو نہیں بتلایا۔ ہاں نشانات دئے اور ایسے

پہنچتے دئے۔ کہ کسی شک کی گنجائش نہ رہے۔ اور وہ کھلی کرامت جس سے ایک مچھلی زندہ ہو گئی لیکن اب کہا جاتا ہے۔ کہ قرآن حکیم کے ہوتے کسی دوسرے مُرشد کی کیا ضرورت قرآن حکیم سے بڑھ کر کون مرشد ہو سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے آگاہ نہیں۔

۵ نہ کتابوں سے نہ کالج کے بے وز سے پیدا

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

کرامت کامل مرشد کا نشان ہے

اکثر اجاب سے سنتا ہوں۔ کہ کرامت کا دلی کے لئے ہونا ضروری نہیں۔ ایسا ہی ہو گا لیکن نشانِ ولایت کیا ہو گا۔ نماز و روزے کے نشانات ان لوگوں میں بھی پائے جاتے ہیں جن کو خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا تھا اور بسا اوقات تجزیہ میں بھی آتا رہتا ہے۔ کہ بعض نفوس شریع کے پابند ہونے کے باوجود اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں لیکن آپ کہیں گے ایسے ہی طریقت والے بھی آج کھوکھلے نظر آتے ہیں۔ یہ بھی ایک دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔ اسی لئے یہ قید کرامت رکھی گئی ہے۔ کہ دھوکے باز الگ ہو جائیں۔ بعض شعبہ باز چالاکی سے کچھ دھوکے دے جاتے ہیں جس سے ایک عامی دھوکا کھا جاتا ہے۔

لیکن کرامت کے ساتھ یہ بھی دیکھنا ہے کہ اسکے اندر مُرشد عالی بھی ہے۔ یا کذاب،

مفتخری شیطان ہے۔

اے بسا ابلیس آدم روئے بہت

پس بہ پروستے نہاید داد دست

مرشد برحق کے کارنامے

مرشد عالی چھپتا نہیں۔ اُس کی ہر ادا ہر لفظ مرشد ہوتا ہے۔ اور ہدایت بخشتا ہے، دلوں کو زور کرتا ہے۔ عقلمندوں کو صاف کرتا ہے۔ اخلاق شستوارتا ہے۔ دل کو مولیٰ کریم کی محبت حقیقہ کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ آنکھوں کو حیلے سے پر کرتا ہے۔ کانوں کو اور زبان کو لغویات کے سننے اور بولنے سے بند کرتا ہے۔ اور اپنے شاگرد کی محبت کے سوا دل میں کچھ نہیں چھوڑتا۔ اور دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتا ہے۔ اور عمر بھر مستقیم کو روز روشن کی طرح واضح کر دیتا ہے۔ اور اس پر پلنے کے لئے سالک کو مستعد کرتا ہے۔ اور جو خدمتِ عالیہ میں پہنچا، یاد حق کی دولت سے مالا مال واپس ہوا۔ مرتے دم تک اُس کی محبت کا نشہ دل و جسم کو کھانا رہتا ہے۔ **الایذکیر اللہ**
تَطْمِئِنُّ الْقُلُوبُ کی حقیقت عیاں ہوتی ہے۔

فیضِ ظاہر و باطن کی تقسیم

پھر جوں جوں زیارت میں فاصلے پیدا ہوتے گئے۔ اور زمانہ نبوت کو دوری ہوتی گئی۔ تو نبوت کے آثار و نشانات کے اثرات بھی اکتھے ظہور پذیر ہونے لگے ہو گئے۔ اور اللہ کریم نے یہ دولت مختلف نفوس پاک میں تقسیم فرمادی۔ کسی کو شریعت حقیقہ کے علوم کا عالم بنایا۔ اور فقہ کی تدوین کے سامان پیدا ہوئے۔ اور کسی کو باطن کے ساتھ زیادہ مناسبت عنایت فرمائی۔ اور سلیمہ نور سے زیادہ انوار فیض اسکے سینہ میں آگئے۔ اور تصوف کی آبیاری کے سامان اکتھے ہونے لگے۔

بیعتِ طریقت کا ثبوت قرآن حکیم میں

اب پہلی نسبتِ اسلامی تو مسلمان گنہگاروں میں پیدا ہونے پر باقی رہی لیکن دوسری نسبتِ انور سے مراد سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک ہے۔

سبت کے لئے جن کو اس راہ کے لئے چنا گیا۔ وہ صاحبِ طریقت کی خدمت میں پہنچ کر اپنی پیاس کو بجھانے کے لئے از سر نو ایک معاہدہ طریقت میں داخل ہوئے۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام باوجود صاحبِ کتاب ہونے کے مجبور ہو گئے کہ بارگاہِ خضر میں عرض کریں۔ هَلْ أَتَيْتَكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَنِي مِمَّا عُلِّمَتْ رُشْدًا ۗ (کہے تو تیرے ساتھ رہوں اس شرط پر کہ مجھ کو سکھلا دے کچھ رشد جو سکھائی گئی تجھ کو)

دیکھئے کس پر معاہدہ ہو رہا ہے۔ صرف رشد پر۔ کہ جو رشد تجھے اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمایا اس میں سے کچھ عنایت ہو۔ تمام کا حاصل ہونا تو کجا ایک کو سبتِ عظمیٰ بھی ہوتی ہے۔ جو فطرتاً کسی کی فطری مناسبت ہوتی ہے لیکن اگر فطرت کمال استعداد نہ رکھتی ہو۔ تو پھر بھی صحبت کے اثرات سے اور تعلیم و تعلم کی وجہ سے کچھ نہ کچھ صاحبِ سند سے حاصل ہو جاتا ہے۔

علم لدنی

لدنی علم کی بات سے بچپن سے کان آشنا چلے آتے ہیں لیکن حقیقت نہیں کھلتی تھی۔ اب کوئی اتنی واضح بات تو نہیں کہی جا سکتی جتنی ”صاحبِ علم لدنی“ بیان کر سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا علم ہے۔ جو صاحبِ علم ہی اس کی بابت خود اندازہ کر سکتا ہے اور کسی دوسرے پر سوائے آثار و نشانات کے کچھ دیکھا نہیں جا سکتا۔

ایک مغالطہ کا ازالہ

علم دوست حضرات کے نزدیک تو اس علم کی کوئی اہمیت نہیں۔ بلکہ علم شریعت

کے سوا ان کے نزدیک کوئی دوسرا علم ہو ہی نہیں سکتا۔ اور کسی دوسرے علم الہی کی بات کچھ سُننا گوارا نہیں کرتے لیکن قرآن حکیم نے اس قصہ میں ایک واضح حقیقت اس علم لدنی کی پیش کردی۔ اور علم شریعت کے سوا ایک دوسرا علم الہی مقابلتاً پیش فرمادیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام علم شریعت کے ملک ہی نہ تھے بلکہ علم شریعت میں توراہ جیسی مکمل کتاب ان پر نازل فرمائی گئی تھی لیکن اس صاحب علم لدنی کی خدمت میں ان کو بھیجا گیا۔ کیوں؟ صرف رُشد حاصل کرنے کے لئے۔

رُشد اور علم کافرق

اور رُشد علم ہی نہیں۔ بلکہ علم سے حاصل شدہ ہدایت کا نام ہے۔ اس کو علم سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ علم ہدایت بھی ہوتا ہے۔ اور ضلالت بھی۔ ابلیس کا علم تمام سے زیادہ تھا لیکن علم نے ہی استنکبار پر اسے اُبھلا دیا۔ اور اس گمراہی میں ڈالا جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ اور کھلے خدائی احکام سے سرتابی کی۔ اس لئے ہم کھلے طور پر کہتے ہیں۔ کہ یہ بھی ایک کھلا دھوکا ہے۔ جو علم کو رُشد کے برابر جانتا ہے۔ قرآن حکیم ہدایت سے بھرپور ہے لیکن لازم ملزوم کے تعلق سے۔

طریقت کی بیعت کیا ہے

ایسے ہی رُشد بھی علم سے حاصل ہوتا ہے۔ اور علم کے سوا بھی رُشد حاصل ہو سکتا ہے۔ بیوں کا رُشد ہونا علم کے سوا موجود ہوتا ہے۔ اس لئے یہ طریقت

آٹھ گئے۔ (غرض استعدادی معاملہ ہے) اور کہیں سالوں مجاہدہ کے بعد ایک پرہ
بھی نہیں اٹھا۔

رشد و ارشاد سے بڑھ کر کسی خدمتِ خلق ہے

ہاں عام جذبہ خدمت سے بزرگانِ طریقت معمور ہوتے ہیں۔ اور رشد و ارشاد
خود کیا ہے؟ یہی خدمتِ خلق اس سے بڑھ کر اور کیا خدمت ہو سکتی ہے۔ کہ خلق
خدا کو غلط راستے سے صحیح راستے پر قدمزن کر کے اس کو اندھیرے گھپ سے
نکال کر نورِ الہی کی طرف پھیر دیا جائے

ذکرِ الہی ہی سالک کا اس المال ہے

لیکن قرآن حکیم اور بزرگانِ سلف رحمہم اللہ علیہم جمعین نے اس راہِ طریقت کے
حصول کے لئے اور معرفتِ الہیہ کے لئے ذکر و فکر کو بڑا درجہ دیا ہے۔ قرآن حکیم میں
جتنا زور ذکرِ الہی پر ہے۔ شاید کسی دوسرے عمل پر اتنا نہ ہوگا۔ کیونکہ مسلمان کا اس المال
افضل الذکر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے اور اسی پر دار و مدار
ایمان ہے۔ سروسٹ ہم چند آیات پیش کرتے ہیں۔

پارہ ۲۲ سورہ اخزاب آیات ۴۱ - ۴۲ - ۴۳ -

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا
اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا وَسَبِّحُوا
بُكْرَةً وَأَصِيلًا هُوَ الَّذِي
سَمِعَ ياد اور پاک بول صبح
اسے ایساں والو یاد کرو اللہ کو
بہت یاد اور پاک بول صبح
و شام وہی ہے جو

يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُ لِيخْرِجَكُمْ
 مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَكَانَ
 بِالْمُؤْمِنِينَ حَيًّا
 اور ایمان والوں پر مسربان ہے۔

ذکر کثیر سے دل منور ہوتا ہے

ذکر کثیر یعنی بہت ذکر کرنے کا ارشاد ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی تسبیح و تہلیل پڑھنے کا۔ اس لئے کہ مولیٰ کریم اور اس کے فرشتے ہر وقت تم پر اپنی طرف سے رحمتیں

لے۔ بعض علم دوست حضرات اس ذکر سے کوئی دوسرا ذکر (صرف نماز) مراد لیتے ہیں اور اللہ
 اللہ کرنے کو ایک فعل عبث قرآن پاک کے برخلاف جانتے ہیں۔ خود دھوکا کھائے ہوئے
 ہیں یا دوسروں کو فریب دیتے ہیں۔ اسم اللہ کے ذکر کرنے کے لئے کئی جگہ آیات بیانات
 محکمہ بلا تاویل موجود ہیں۔

(۱) وَإِذْ كُنَّا نَسْمُرُ بِكَ وَتَبَتَّلْ
 لِيَدِهِ تَبَتَّلًا (مزل)
 اور اپنے رب کے نام کا ذکر کر اور اس کی طرف
 سب سے الگ ہو جاؤ گے ہو جانا

(۲) وَإِذْ كُنَّا نَسْمُرُ بِكَ بُكْرَةً
 وَأَصْبَلًا (الدھم)
 اور اپنے رب کے نام کا ذکر کر صبح
 اور شام۔

(۳) قَدْ أَفْنَحَ مَنْ تَزَكَّى وَذَكَرَ
 اسْمَ رَبِّهِ فَصَلِّ (اعلیٰ)
 بے شک نجات پا گیا وہ جو پاکیزہ ہو اور اپنے
 رب کے نام کا ذکر کیا اور نماز پڑھی۔

(۴) وَيَذُكَّرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ
 كَثِيرًا (رجح) وغیرہ وغیرہ
 اور ان میں اللہ کے نام کا ذکر بہت کیا
 جاتا ہے۔

پھر ذکر کثیر کا لفظ خود بھی اتنا جامع مانع ہے۔ کہ کوئی دوسری چیز نماز وغیرہ اس شمار میں
 نہیں آسکتی۔ صرف ذکر کثیر۔ خود بتلاتا ہے۔ کہ اللہ اللہ کرنا مراد ہے۔

بھیجتے ہیں۔ تاکہ تم اندھیروں سے نکل کر نور حق دیکھ پاؤ۔ غرض ذکر کثیر رحمتِ الہی اور اس کی پاک مخلوق نوری کی رحمتوں کا باعث ہوتا ہے۔

دل خواہشات سے نکل کر انوار میں داخل ہو تو یہی معرفتِ الہی ہے

اور جب رحمتِ الہی منواتر انسانی دل پر وارد ہوتی ہے۔ تو دل بشری ظلمات یعنی خواہشات نفس کے اندھیروں سے نکل کر تجلیاتِ الہی کے انوار میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہی طریقت و معرفت ہے۔ اسلام صرف شرائع نہیں سکھاتا۔
شرائع کے ساتھ باطن کو انوار معرفت سے روشن کرنا چاہتا ہے۔

احکامِ شریعت معرفت کا پہلا قدم ہے

شریعت بے شک پہلا قدم معرفتِ الہیہ کا ہے۔ لیکن صرف شریعت کے احکام ظاہر پر اس نورِ مطلق تک نہیں پہنچاتے۔ جب تک احکام سے بڑھ کر دل کی تو جہاں ذاتِ اقدس کی طرف نہ بڑھے۔ اور یہ حاصل ہوتی ہے۔ ذکر کثیر سے۔ جسے آج کی اسلامی دنیا ایک عبتِ فعل خیال کرتی ہے۔

سلاطینِ عالم ذکر کے نور کے سامنے جھک گئے

عام خیال یہ ہے۔ کہ الفاظ کی رٹ سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔ جسے شک عام الفاظ کی رٹ سے کچھ حاصل نہ ہوتا ہوگا۔ لیکن اللہ کے نام کی رٹ کبھی بے ضائع نہیں ہوتی۔ لاکھوں نہیں کروڑوں انسان صرف اسی رٹ سے خدائے قدوس کی

معرفت تک پہنچ گئے۔ تاریخ شاید ہے۔ اور دنیا گواہ۔ سلاطین عالم ان کے سامنے
 جھکے۔ اور صرف مسلمان بادشاہ نہیں بلکہ غیر مسلم بھی ان کے سامنے سر جھکا گئے۔
 کیوں؟ خالی پتے کے لئے یا اس نورِ مطلق کی روشنی کی وجہ سے جو اس خالی پتے
 کے اندر ذکرِ نبی سے چمک اٹھی؟۔

۵ یاد اور سرمایہٴ ایمان بود ہر گدا از یاد او سلطان بود

موسیٰ علیہ السلام کو خضر علیہ السلام کے پاس کیوں جانا پڑا

بہر صورت جو یہ کہا جاتا ہے کہ احکامِ شریعت کے سوا طریقت کچھ اور نہیں۔
 یہ آیات کھلے طور بتلاتی ہیں۔ کہ موسیٰ علیہ السلام خود شریعت کے مالک تھے۔
 پھر بھی ان کو طریقت کی طرف قدم اٹھانے کے لئے حکم فرمایا گیا۔ اس لئے ہر اس
 نفس پر جو اللہ تعالیٰ کے معارف دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے شریعت سے
 آگے ایک اور قدم بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اور اسی ضرورت کے لئے مولا
 کریم نے موسیٰ علیہ السلام کی توجہ کو اٹھایا۔

مرشد کی ضرورت

موسیٰ علیہ السلام خود خالقِ حقیقی سے کلام فرماتے تھے۔ خود صاحبِ کتاب
 تھے۔ الہامِ وحی سے تعلیم دلائی جاسکتی تھی لیکن ایسے نہیں کیا گیا۔ بلکہ خود انہیں
 جیسے انسان کو جسے اپنے علمِ حقیقی سے سرفراز فرمایا گیا تھا ان کی تربیتِ طریقت
 کے لئے منتخب فرمایا۔ پھر نام و نشان تو نہیں بتلایا۔ ہاں نشانات دئے اور اپنے

پختہ وئے۔ کہ کسی شک کی گنجائش نہ رہے۔ اور وہ تھی کرامت جس سے ایک مچھلی زندہ ہو گئی لیکن اب کہا جاتا ہے۔ کہ قرآن حکیم کے ہوتے کسی دوسرے مُرشد کی کیا ضرورت قرآن حکیم سے بڑھ کر کن مُرشد ہو سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے آگاہ نہیں۔

۵ نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

کرامت کامل مُرشد کا نشان ہے

اکثر اجاب سے سنتا ہوں۔ کہ کرامت کا دلی کے لئے ہونا ضروری نہیں۔ ایسا ہی ہو گا لیکن نشانِ ولایت کیا ہو گا۔ نماز و روزے کے نشانات ان لوگوں میں بھی پائے جاتے ہیں جن کو خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل فرمایا تھا اور بسا اوقات تجزیہ میں بھی اتار رہتا ہے۔ کہ بعض نفوس شریع کے پابند ہونے کے باوجود اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں لیکن آپ کہیں گے ایسے ہی طریقت والے بھی آج کھوکھلے نظر آتے ہیں۔ یہ بھی ایک دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔ اسی لئے یہ قید کرامت رکھی گئی ہے۔ کہ دھوکے باز الگ ہو جائیں۔ بعض شعبہ باز چالاکوں سے کچھ دھوکے دے جاتے ہیں جس سے ایک عامی دھوکا کھا جاتا ہے۔

لیکن کرامت کے ساتھ یہ بھی دیکھنا ہے کہ اسکے اندر مُرشد عانی بھی ہے۔ یا کذاب،

مفتخری شیطان ہے۔

اے بسا ابلیس آدم روئے بہت

پس بہ ہر دستے نباید داد دست

مرشد برحق کے کارنامے

مرشد عالی چھپتا نہیں۔ اُس کی ہر ادا ہر لفظ رُشد ہوتا ہے۔ اور ہدایت بخشتا ہے، دلوں کو نرم کرتا ہے۔ عقلموں کو صاف کرتا ہے۔ اخلاق سُستوارتا ہے۔ دل کو مولیٰ کریم کی محبتِ حقہ کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ آنکھوں کو جیل سے پُر کرتا ہے۔ کانوں کو اور زبان کو لغویات کے سینے اور بونے سے بند کرتا ہے۔ اور اپنے مولا کی محبت کے سوادِ دل میں کچھ نہیں چھوڑتا۔ اور دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتا ہے۔ اور صرِّ اکتسیمیہ کو روز روشن کی طرح واضح کر دیتا ہے۔ اور اس پر چلنے کے لئے سائک کو مستعد کرتا ہے۔ اور جو خدمتِ عالیہ میں پہنچا، یا حق کی دولت سے مالا مال واپس ہوا، مرنے دم تک اُس کی محبت کا نشہ دل و جسم کو کھانا رہتا ہے۔ **الْأَبْدَانُ كَرَامَةُ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ** کی حقیقت عیاں ہوتی ہے۔

فیضِ طاہر و باطن کی تقسیم

پھر جبل جو نیابت میں فاصلے پیدا ہوتے گئے۔ اور زمانہ نبوت کو دوری ہوتی گئی۔ تو نبوت کے آثار و نشانات کے اثرات بھی اکٹھے ظہور پذیر ہونے لگے ہو گئے۔ اور اللہ کریم نے یہ دولت مختلف نفوس چمک میں تقسیم فرمادی۔ کسی کو شریعتِ حقہ کے علوم کا عالم بنایا۔ اور فقہ کی تدوین کے سامان پیدا ہوئے۔ اور کسی کو باطن کے ساتھ زیادہ مناسبت عنایت فرمائی۔ اور شیعہ انور سے زیادہ انوار و فیوض اس کے سینہ میں آگئے۔ اور تصوف کی آبِ حیات کے سامان اکٹھے ہونے لگے۔

بیعتِ طریقت کا ثبوت قرآن حکیم میں

اب پہلی نسبتِ اسلامی تو مسلمانانِ کلمہ میں پیدا ہونے پر باقی رہی لیکن دوسری نسبت انور سے مراد سرورِ دُعا عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک ہے۔

نسبت کے لئے جن کو اس راہ کے لئے چنا گیا۔ وہ صاحبِ طریقت کی خدمت میں پہنچ کر اپنی پیاس کو بجھانے کے لئے از سر نو ایک معاہدہ طریقت میں داخل ہوئے۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام باوجود صاحبِ کتاب ہونے کے مجبور ہو گئے کہ بارگاہِ خضر میں عرض کریں۔ هَلْ أَتَيْتَكَ عَلَىٰ أَنْ تَعْلِمَ مِنَّمَا عَلَّمْتَ رُشْدًا ۗ اِذْ رَكِبْتَهُ وَتَوَيَّرْتَهُ سَاقِدًا ۗ هَؤُلَاءِ مِمَّنْ رُشِدًا ۗ اِذْ رَكِبْتَهُ وَتَوَيَّرْتَهُ سَاقِدًا ۗ هَؤُلَاءِ مِمَّنْ رُشِدًا ۗ اِذْ رَكِبْتَهُ وَتَوَيَّرْتَهُ سَاقِدًا ۗ

جو سکھائی گئی تھی کہ وہ دیکھئے کس پر معاہدہ ہو رہا ہے۔ صرف رُشد پر۔ کہ جو رُشد تجھے اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمایا اس میں سے کچھ عنایت ہو۔ تمام کا حاصل ہونا تو کجا ایک کو بہت عطا بھی ہوتی ہے۔ جو فطرتاً کسی کی فطری مناسبت ہوتی ہے لیکن اگر فطرت کمال استعداد نہ رکھتی ہو۔ تو پھر بھی صحبت کے اثرات سے اور تعلیم و علم کی وجہ سے کچھ نہ کچھ صاحبِ سند سے حاصل ہو جاتا ہے۔

علم لدنی

لدنی علم کی بات سے بچپن سے کان آشنا چلے آتے ہیں لیکن حقیقت نہیں کھلتی تھی۔ اب کوئی اتنی واضح بات تو نہیں کہی جاسکتی جتنی ”صاحبِ علم لدنی“ بیان کر سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا علم ہے۔ جو صاحبِ علم ہی اس کی بابت خود اندازہ کر سکتا ہے اور کسی دوسرے پر سوائے آثار و نشانات کے کچھ دیکھا نہیں جاسکتا۔

ایک مخالطہ کا ازالہ

علم دوست حضرات کے نزدیک تو اس علم کی کوئی اہمیت نہیں۔ بلکہ علم سرایت

کے سوا ان کے نزدیک کوئی دوسرا علم ہو ہی نہیں سکتا۔ اور کسی دوسرے علم الہی کی بات کچھ سُننا گوارا نہیں کرتے لیکن قرآن حکیم نے اس قصہ میں ایک واضح حقیقت اس علم لدنی کی پیش کر دی۔ اور علم شریعت کے سوا ایک دوسرا علم الہی مقابلتاً پیش فرما دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام علم شریعت کے مالک ہی نہ تھے بلکہ علم شریعت میں توراہ جیسی مکمل کتاب ان پر نازل فرمائی گئی تھی۔ لیکن اس صاحب علم لدنی کی خدمت میں ان کو بھیجا گیا۔ کیوں؟ صرف رُشد حاصل کرنے کے لئے۔

رُشد اور علم کافرق

اور رُشد علم ہی نہیں۔ بلکہ علم سے حاصل شدہ

ہدایت کا نام ہے۔ اس کو علم سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ علم ہدایت بھی بخشتا ہے۔ اور ضلالت بھی۔ ابلیس کا علم تمام سے زیادہ تھا۔ لیکن علم نے ہی استکبار پر اسے اُبھلا۔ اور اس گمراہی میں ڈالا۔ جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ اور کھلے خدائی احکام سے سرتابی کی۔ اس لئے ہم کھلے طور پر کہتے ہیں۔ کہ یہ بھی ایک کھلا دھوکا ہے۔ جو علم کو رُشد کے برابر جانتا ہے۔ قرآن حکیم ہدایت سے بھرپور ہے لیکن لازم ملزوم کے تعلق سے۔

طریقیت کی بیعت کیا ہے

ایسے ہی رُشد بھی علم سے حاصل ہوتا ہے۔ اور علم کے سوا بھی رُشد حاصل ہو سکتا ہے۔ یہیوں کیا رُشد پیدا ہونا علم کے سوا موجود ہوتا ہے۔ اس لئے یہ طریقیت

کی بیعت، احکام الہیہ کے جاننے پہچاننے کے لئے نہیں ہوتی۔ بلکہ رشد حاصل کرنے کے لئے۔

رشد کا ترجمہ ایک مترجم نے بھلی راہ لگھا ہے۔ اس سے بلند بھی کوئی ترجمہ ہونا چاہیے۔ جو لفظ رشد کے ساتھ برابری کر سکے۔

بیعت کی اصل

عام اعتراض ہے۔ کہ بیعت اسلام کے سوا کوئی دوسری بیعت نہیں اور یہ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی دوسری بیعت نہیں لی۔ اول تو نبوت چونکہ سراسر چشمہ نور ہدایت ہوتا ہے۔ اور جہاں اسلام کی بیعت لی گئی۔ وہاں سے طریقت کی بیعت خود بخود ہوتی گئی۔ اور اپنی استعداد کے مطابق ہر صحابی نے صلاحیت اور رشد حاصل کیا۔ جہاں وہ علوم شرعیہ سے واقف ہوئے۔ وہاں ترکیب کی دولت بھی ساتھ حاصل ہوئی گئی۔ اور حکمت بھی آگئی۔ فرماتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ طَيْدُ اللَّهِ
وہ ہاتھ ملائے ہیں اللہ سے۔ اللہ کا ہاتھ
فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَبَايِعُونَكَ وَهُم لَا يُبَايِعُونَكَ
اوپر ان کے ہاتھ کے ہے۔

فرمائیے اب یہ دولت کیسے حاصل ہوئی۔ نبی کریم کے ہاتھ سے ہاتھ ملانا۔ جو سراسر خود نور تھے۔ اور اس نور پر نور مطلق کا ساتھ خصوصی تھا۔ اسی وجہ سے فرمایا گیا۔ جس نے تجھ سے ہاتھ ملائے۔ اس نے اللہ سے ہاتھ ملائے۔ اور اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے۔ جس پر اللہ کا ہاتھ ہو جائے اسے پھر کسی دوسرے

سے ہاتھ بلانے کی کیا ضرورت ہے۔

تصوفِ قدیم اور بعد کے تصوف میں فرق

نبوت کے انوار سے کسی کا نور کتنا بھی مشابہت رکھتا ہو لیکن وہ اور، یہ اور۔ پھر بعد نبوت نے آثار و نشانات اور انوار کے اندر کئی صورتیں پیدا کر دی ہیں۔ موجودہ تصوف کتنا ہی بلند خیال کر لیا جائے۔ اس تصوف سادہ کے ہم رنگ ہونا محال۔ گویا کئی پر داز۔ اور تصورات میں کتنا ہی وسیع اور بلند کیوں نہ نظر آئے۔

بیعت کا بہترین مفہوم

بیعت کا لفظ بیع سے ہے جسے خرید و فروخت میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلامی بیعت کے لئے یہ لفظ اس لئے استعمال کیا گیا۔ کہ ایک گونہ نفس انسانی اپنی ذات کو ذاتِ حقِ جل و علا کے لئے فروخت کر دیتا ہے۔ اور اس معاہدہ اسلامی کو بیعت کا نام دیا گیا۔

حدیبیہ کے مقام پر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مکہ معظمہ کے رؤسا کے پاس رسالت کے فرائض سزا انجام دینے کے لئے بھیجا۔ تو آپ نے اس جنگ کے لئے بیعت لی۔ اور اس میں تمام نے حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور خود جناب رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہاتھ اپنا اور دوسرے کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تصور کرتے ہوئے ان کی بیعت کا اعلان فرمایا۔

بیعت اسلام میں داخل ہونے کے لئے کھٹی

جہاں دوسرے مذاہب میں مذہب کے اندر داخل ہونے کے لئے کچھ رسوم ظاہریہ تجویز شدہ ہیں۔ ایسے ہی اسلام میں بعض امور کو قبول کرنے کے لئے بیعت کی بنیاد پر لگنی۔ مثلاً بیعت خلافت تو عام شروع ہی میں اسلام کے اندر دکھائی دیتی ہے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال فرمایا۔ تو خلیفہ اول کے ہاتھ پر مسلمانوں نے بیعت کی یہاں تک کہ خورد و کلاں اس بیعت سے سرفراز ہوئے۔ ایسے ہی یکے بعد دیگرے جلا آیا اور بعد میں جب خلافت بلوکیت میں تبدیل ہو گئی۔ تو پرانے طریقہ پر بلوک اسلام بھی بیعت لیتے تھے۔ اور بیعت ہی پر خلافت یا بلوکیت کا دار و مدار ہوتا تھا۔

بیعت طریقت بھی ایک عہد ہے

”اسی طرح طریقت کے اندر بھی ایک دوسری بیعت چل گئی۔ اور وہ کھٹی بیعت طریقت۔ اور یہ تھا معاہدہ اثنبار طریقت کا۔ یعنی پیرو مرشد کے فرمان پر چلنے کا۔ دوسری بیعتوں کی رسم تو ختم ہو گئی لیکن طریقت کی بیعت آج تک اپنی پوری شان کے ساتھ چلی آتی ہے۔ اور جو بھی کوئی ساکب اپنا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں دے بیٹھتا ہے۔ تو پھر اسکے حکم اور اوامر کے نبھاؤ کی انتہائی گوشمیش میں رہا۔ یہاں تک کہ خود مرشد ٹھیک ہونے لگے۔“

۱۔ یعنی رشد و ارشاد کا راستہ خود مرشد چھوڑ بیٹھے

موجودہ بعیت کا ایک نقص

تاہم اگر کوئی بھی کسی ایسے مرشد کے ہاتھ میں ہاتھ دے بیٹھے جسے بعض عیویب سے اچھا نہ سمجھے۔ پھر بھی وہ سرتابی کو سرتابی طریقت خیال کرتا ہے حالانکہ یہ کھلی بات ہے کہ جب پیر و مرشد پر اس کی عظمت و عزت نہ رہے؟ تو مرشد کیسا اور مرید کیسا لیکن رسوم جاہلیت کی طرح یہ رسم بد بھی طریقت میں اب پیدا ہو گئی ہے

مرشد کون ہو سکتا ہے

کسی زمانے میں مرشد کی مسند پر وہی بیٹھتا تھا۔ جسے پیر و مرشد پوری طرح طریقت کے مجاہدوں سے پاک کر کے اسے ارشاد کی اجازت دیتے تھے۔ پھر بھی وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی سے گھبراتا تھا۔ اور ارشاد کے بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار نہ ہوتا۔ حتیٰ کہ مولائے کریم خود الہام فرماتے۔ اور اُس الہام سے نصرت الہی کا وعدہ فرماتے اُس وقت وہ سالک دعوت کا ہاتھ پھیلاتا۔ اور لوگوں کو تلقین فرماتا۔

مرشد کی روحانی اولاد اور جسمانی اولاد

لیکن جیسے دوسرے امور میں بعض موقوفہ پر مشتمل جسمانی بطن ہو کر خلق اللہ کی گمراہی کا باعث ہوا۔ اسی طرح طریقت میں مرشد کی اولاد و اقربا کے ساتھ بے انداز محبت سے بھی اہل مقصد سے شکوہا ہری عقیدہ پر اچھے لوگوں کا ایمان اُتر آتا ہے۔ اور پیر و مرشد کے اظہار کے باوجود اولاد و مرشد پر ٹوٹنے اور ان کو صحیح مرشد خیال

کہتے ہیں۔ مرشد کی اولاد کی عزت و عظمت طریقت میں واجب ہے۔ لیکن مرشدِ عالی کی اولاد کی وجہ سے نہ طریقت کی وجہ سے۔ طریقت ایسی صورت میں یہ فتویٰ دیتی ہے۔ کہ جسمانی اولاد سے بڑھ کر روحانی اولاد مرشد کی طرف اپنا رخ بدل دیا جائے۔ قَوْلُوا وُجُوْهُكُمْ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط کے حکم کے مطابق فوراً رخ بدلیں۔ اور کسی چون و چرا کے بغیر فوری حکم کی تعمیل کی جائے۔

بیعت کا اثر

عام خیال یہ ہے۔ کہ بیعت ظاہری سے کیا فائدہ لیکن قرآن حکیم میں خود اسی مفاد کو ظاہر فرماتے ہیں۔ لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ کے ساتھ ارشاد فرماتے ہیں۔ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ۔ یعنی اس وقت اطمینان و آرام قلبی ان پر آجاتا ہے۔ اور مطمئن ہو جاتے ہیں۔

حضورِ کامل کا اصل مفہوم

اب بھی کامل مرشد کی بیعت کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ کہ ایک طرف بیعت کی۔ دوسری طرف اطمینان قلب نصیب ہو گیا۔ طہ بیعت کیسے ہوگی۔

۱۔ ترجمہ: بے شک اللہ راضی ہوا مومنوں سے جب وہ آپ کی بیعت درخت کے نیچے کرتے تھے پس ان کے دلوں کی بات اللہ کے علم میں ہے۔

عظمت لاکھرا پھر اطمینان (السکینہ) ان پر نازل فرمایا۔

اور یادِ الہی کے اندر دل و جان غرق ہو گئے۔ حضرت سلطان باہر حرمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ کہ جو مرشد صرف بیعت پر ہی حضورؐ نہ کرے۔ وہ کیا مرشد ہو گا۔ حضورؐ کے معنی کوئی کچھ سمجھے۔ ہمارے خیال میں یہی اطمینان ہے جس کے اندر انوارِ الہیہ کے شعاعے روشن ہو سکیں۔ بعض علم دوست حضرات کو سکینہ پر بھی شاید اعتراض ہو۔ کہ وہ کیا چیز ہے۔ اس کی بابت خود قرآن حکیم کی آیت ملاحظہ ہو جو اس حقیقت کبریٰ کو واضح فرماتی ہے۔

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ تَوْجِه: مولا کریم وہ ذاتِ اقدس ہیں جو منین
فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزِدُوا كے دلوں میں اطمینان اور صبر آواتے ہیں تاکہ
إِيمَانًا مَعَ إِيْمَانِهِمْ ان کے ایمان کے ساتھ ایک اور ایمان
بڑھ جائے۔

ایمان کی حقیقت

خود دیکھئے ایک ایمان اسلامی موجود ہونا ہے سکینہ سے ایک ایمان ساتھ ہو کر پہلا ایمان تقویت میں وگنا ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی جب بیعت کی جاتی ہے۔ تو مسلمان کے پہلے ایمان کے ساتھ سکینہ اطمینان و تسلی پیدا ہونے سے ایک اور ایمان دل میں پیدا ہو جاتا ہے جس سے ایمان ایقان کے مدارج میں ترقی کر جاتا ہے۔ ایمان کیا ہے! یقین اور صرف یقین۔ ان عقائد پر جنہیں اسلام نے اپنے پیروں کے لئے ضروری قرار دیا۔

بیعت کو جو لوگ بدعت خیال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں لیکن قرآن حکیم سے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ وہ کیا کچھ طلب کرتے ہیں جب

قرآن شہادت دیتا ہے۔ نبی کریم خود فرماتے ہیں۔ خلفا کرتے آئے۔ تو اب اگر کوئی
 طریقت کی بیعت اسی طریقہ پر لے لے تو کیا حرج۔ ایک معاہدہ ہے۔ جیسے موسیٰ
 علیہ السلام نے کیا۔ اور جسے نبھاؤ کے لئے پہلے ہی کہہ دیا گیا۔ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ
 مَعِيَ صَبْرًا۔ کسی صورت میرے ساتھ نہ نبھاؤ گے۔ حالانکہ خود حضرت نے
 عرض کیا تھا هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰی اَنْ تُعَلِّمَنِيْ مَا عَلَّمْتَا رُشْدًا كَوْرًا
 موسیٰ علیہ السلام خود جانتے تھے۔ کہ یہ دولت اتباع کے بغیر ناممکن ہے۔ اور مرشد
 کا اتباع ہی ہے۔ جو یہ دولت عظمیٰ (رشد) دلاتا ہے۔

طریقت میں چون و چرا کی اجازت نہیں

عظمت محبت جب دل پر چھا جاتی ہے۔ اول تو دل پر ایک رعب
 ایک حیا چھا جاتا ہے اور خود سناک کا دل خاموش ہو جاتا ہے۔ اور کسی سوال
 کسی اعتراض کو اپنے اندر پانہیں سکتا لیکن بعض طبائع من چلی ہوتی ہیں۔ اور اعتراض
 و شکوک ان کے اندر بہت اٹھتے ہیں اس لئے طریقت کا فیصلہ یہ دلایا گیا۔
 فَلَا تَسْأَلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ۔ تم مجھ سے کچھ نہ پوچھنا۔ حَتّٰى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ
 ذِكْرًا جب تک میں خود نہ اسے کہوں۔ صاحب طریقت کے سامنے خاموشی اور
 اس کے ہر امر کو ایک حقیقت سمجھا جاوے اور اس کے کسی فعل پر اعتراض نہ رکھا جائے۔

چون و چرا اطمینان ضائع کر دیتا ہے

اس کا فلسفہ یہی ہے۔ کہ اگر تنقید کا راز کھلا رکھا جائے۔ اور ہر سناک کے

اعتراض بردھیان دیا جائے۔ تو ایک سالک مطلق العنان ہو کر آوارہ ہو جائیگا۔
دوسرے خود مرگتی اور مرشد ہر وقت اس الجھاؤ میں پڑا رہے گا۔

فرماتے ہیں۔ لَا تَسْتَأْذِنُوا عَنْ أَشْيَاءِ إِرَانِ تَبَدَّلَكُمْ نَسْوَكُمْ
(مومنوں) مت پوچھو بہت چیزیں۔ کہ اگر تم پکھولے۔ تو تم کو بُری لگیں یعنی امور کی
حقیقت مت دریافت کرو۔ اگر ان کی حقیقت تم پکھول دی جائے۔ تو بعض وقت
تم کو بُری معلوم ہوں گی۔ ہاں اگر نزولِ قرآن کے وقت دریافت کرو گے۔ تو ان کی
اصلیت ظاہر کر دی جائے گی۔ مطلب یہ ہے۔ حکم پر نہ پوچھو لیکن جب وقت ہو۔ تو
دریافت پر تبادلا بھی دی جاؤں گی۔ جیسے خود حضرت فرماتے ہیں لَا تَسْأَلْنِي عَنْ
شَيْءٍ - پھر فرماتے ہیں۔ حَتَّىٰ أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا۔

عموماً مرشد وہ حقائق جو کسی کی سمجھ میں بوقتِ امر و نواہی۔ یا بوقتِ کارکردگی نہیں
کھلتے۔ جب وقت آتا ہے۔ اور طبیعت کھلتی ہے تو خود بیان کر دیتے ہیں۔ کہ اس
حکمت سے یہ کام کرایا گیا۔ اور اس حکمت سے یہ کام نہ کیا۔

قصہ موسیٰ و حضرتیں خاموش رہنے کی حقیقت

خود قصہ ہی راز کھولتا ہے۔ کہ جب دریافت کیا۔ تو فرمایا خاموش! نہیں کہا
گیا۔ کہ تم میرے معاملہ پر صبر نہ کرو گے لیکن جب کچھ ہو ہوا گیا۔ تو خود حضرت صاحب نے
تمام حقیقت کھول دی۔ اور بعد میں کہہ دیا۔ وَمَا قَعَلْتُمْ عَنْ أَمْرِي۔ میں نے
اپنے ارادے سے یہ سب کچھ نہیں کیا۔

مُرشد کے سامنے تسلیم و رضا کی حکمتِ اعلیٰ

غرض طریقت میں اتباع کے ساتھ باطن کو بھی چون و چرا سے پاک رکھنا ضروری ہے اہل مقصود کو تسلیم و رضا کے سبق دلانے ہوتے ہیں۔ اور یہ سالک کو حکمِ الہی کے لئے بلا چون و چرا عمل میں لانے کے لئے تیار کرنا ہوتا ہے۔ کہ حکمِ الہی پر کوئی اعتراض نہ نہ اٹھے۔ سر اسر تسلیم و رضا ہو۔ اور تقدیر الہی پر ایمان دار بنانے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے۔ کہ جب مرشد کے افعال و حرکات سر اسر حکمت ہو جاتے ہیں۔ تو مولائے کریم خالق و رازق کے تمام احکام کیا تشریحی کیا تکوینی سر اسر مصاحت نہ ہونگے؟ ہوں گے اور ضرور ہوں گے۔ بلکہ طبیعت کے اندر سے یہ بشری تقاضا بالکل بند ہو جاتا ہے۔ کہ یہ کیوں، اور وہ کیوں۔ سر اسر حق۔ سر اسر عدل۔ سر اسر رحم نظر آتا ہے۔

لفظ مرشد کا ماخذ

بعض علم دوست لفظ مرشد سے بھی گھبراتے ہیں۔ کہ یہ کیا لفظ ہے۔ نہ رسول نہ امام لیکن طریقت والوں نے اسی رُشد سے صاحبِ رُشد کے لئے مرشد کی اصطلاح اختیار کی جس کے معنی رہبر کے ہیں۔ اور ایک گونہ امتیاز کے لئے امام کے سوا دوسرا لفظ منتخب کر لیا گیا۔ ورنہ جو امام کا مفہوم ہے تقریباً ہی معنی یہ رکھتا ہے۔ تاہم حقیقت میں قدر سے فرق ہے۔ اس وقت امام اور معنی میں استعمال ہوتا ہے اور مرشد اور معنی میں۔ فرق کو بہت کم ہے۔

غیب دانی اور اولیاء اللہ

طریقیت میں غیب دانی کا عقیدہ کچھ شریعت کے رُو سے نہیں مٹھتا ہے بلکہ واردات کی وجہ سے جب سالک عام تجربہ میں بعض امور کا انکشاف مرشد کی زبان سے سنتا ہے۔ اور بعض تشبیہ یا حکم وہ سنتا ہے۔ جو عام ظہور میں نہیں آئے ہوتے۔ تو لامحالہ طبیعت میں اس قسم کا خیال پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ میرا مرشد غیب پر بھی نظر رکھتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ عقیدہ کبھی بھی نہیں آتا۔ کہ یہ سب کچھ جانتا ہے۔ بلکہ بعض اشیاء ضروریہ کا علم سامنے آ جاتا ہے جس سے ایک گونہ پیشگوئی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ کوئی اختیار کی بات نہیں۔ خود اسی قصہ میں حضرت خضر کے کلمات ایسے ہیں جن سے غیب ٹپکتا ہے۔ جیسے بادشاہ کشتیاں بیکار میں بڑے آتا ہے یا جیسے یہ لڑکا اپنے باپ دادا کو ذلیل کرنے کا باعث ہوگا۔ یا بچوں کا باپ نیک تھا۔ اور دیوار کے نیچے خزانہ ہے۔ خود سوچے۔ جب کوئی یہ پوشیدہ باتوں کو کسی سے ظاہر ہوتا دیکھے۔ تو اس کے اس اظہار کو کیا نام دے۔ اور اس حقیقت کے لئے کیا لفظ استعمال کرے۔ کچھ بھی ہو اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں غیب کی جگہ کوئی اور لفظ ایسے اظہار کے لئے بنا لیا جاوے۔

امور منکرہ اور سالک

افعال قبیہ بعض وقت جب سالک سے ظہور پکڑتے ہیں۔ تو صاحب شریعت پاسبانی شریعت کرتے ہوئے صاحب ولایت کو وہ کچھ سناتے ہیں۔ جو کوئی

ہیں سن سکتا۔ بلکہ دین و اسلام سے خارج کر دیتے ہیں۔ لیکن خود یہ مطالبہ نہیں
 دیتے۔ کہ اس کا ثبوت تو خود قرآن حکیم ہے۔ خود شہادت دیتا ہے۔ اور خود موسیٰؑ
 جیسے صاحبِ شریعت کو یہ معاملہ پیش آیا۔ تو قرآن حکیم نے صاحبِ ولایت کا دامن
 اٹھو دہونے سے ہی نہیں بچایا۔ بلکہ اس کے اس فعل کو ایک حکمتِ الہی اور ایک حکم
 الہی کا تصور دلاتے ہوئے صاحبِ ولایت کے علم کو علمِ لدنی سے تعبیر فرمایا۔ ایسے
 ہی اگر ہمارے بزرگ ایسے موقع پر نیک تاویل لیں۔ تو قرآن کریم کی متابعت سے ان کو
 کتنا بلند درجہ ملے گا۔ اور مولا کریم کی قدرتِ کاملہ پر کتنا ایمان بلند ثابت ہونے کا
 اظہار ہوگا۔ عارفِ رومی نے اس مسئلہ کو خوب حل فرمایا ہے

گاہ چناں بنماید و گاہ ضدِ این جز کہ حیرانی نباشد کارِ ویں
 یعنی کبھی تو شریعت کے احکام کا زور ہے۔ اور کبھی اس کے برخلاف ظہور کر کے
 مقدرات پیش کر دیتے ہیں۔ سچ یہ ہے۔ کہ دین کا معاملہ حیرانی کے سوا کچھ نہیں دیکھئے
 ضد کو بھی کارِ دین خیال فرمایا۔ ویسے ہی طریقت کے بعض نامناسب اور ناموافق
 امورات بھی حقیقتاً دین کا ایک جز و لاینفک ہیں اس کے سوا شریعتِ حنفیہ بھی مکمل
 نہیں ہوتی۔ کیونکہ جو کچھ قرآن حکیم میں ہے۔ وہ سراسر شریعت ہے۔ اور یہ طریقت
 کی کارِ ماثیات جب خود ہی بیان فرماتے ہیں اور خود ہی اس کی تصدیق فرماتے ہیں۔
 اور خود ہی انہیں اپنی طرف منسوب کرتے ہیں تو پھر کیونکر انہیں شریعتِ الہیہ سے
 باہر خیال کیا جاوے۔ گو ایک ظاہرین اس کو شریعتِ الہیہ میں جگہ نہیں دے سکتا
 اگرچہ ظاہر شریعت میں یہ امور نا پسندیدہ ہوں لیکن باطن میں انہیں کیوں
 اسے الگ کریں۔

معیت کا درجہ

طہریت میں معیت کو بڑا دخل ہے معیت کے معنی ساتھ رہنا ہے۔ جب انسان کسی انسان کے ساتھ رہتا ہے تو اس کے اخلاق و عادات سے بہت کچھ اس کے افکار پر اثر پڑتا ہے۔ اور جس درجہ صاحبِ معیت کے آثار اخلاق و عادات اور افکار بہت ہوتے ہیں۔ اسی درجہ کے علم طلب طہریت کے اندر انسان کو جوجائے ہیں۔ اور سالک اپنے مشد طہریت میں معیت میں اپنا حصہ جہاں اس کی استعداد اور خواہش نہ پہنچی اس قدر ترقی۔

معیت میں ایک بڑی مشکل

لیکن اس معیت میں ایک بڑی مشکل ہے۔ جو یہ ہے۔ جو صاحبِ معیت کو تا بعد رکھ دینا چاہئے۔ اور اس سے بچنا چاہئے۔ جو صاحبِ معیت کو تا بعد رکھ دینا چاہئے۔ اور اس سے بچنا چاہئے۔ جو صاحبِ معیت کو تا بعد رکھ دینا چاہئے۔ اور اس سے بچنا چاہئے۔

مشق کے بغیر ہر حکمت کا پتہ نہیں چل سکتا

یہ سب قرینت یا قرینہ ہے۔ جو صاحبِ معیت کو تا بعد رکھ دینا چاہئے۔ اور اس سے بچنا چاہئے۔ جو صاحبِ معیت کو تا بعد رکھ دینا چاہئے۔ اور اس سے بچنا چاہئے۔

معیت میں صبر ہی مقصود ہے

ایک طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام صاحب کتاب تھے۔ اور دوسری طرف حضرت نضر ایک امتی تھے۔ گو حکم مل چکا تھا۔ کہ انہیں استاؤ پکڑو۔ اور ان سے رہبری حاصل کرو لیکن ایک تو طبعی مناسبت نہ تھی۔ دوسرے حضرت موسیٰ علیہ السلام اتنے بلند پایہ انسان ان کو خیال نہ کرتے تھے۔ گو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود ہل اَتَّبِعَكَ عَلَيَّ اَنْ تَعْلَمَ مِنْ - عرض کر دیا تھا لیکن فطرت شناس حضرت نضر نے فوراً جواب دیا۔ كُنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَابِرًا (تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے) اور اصل مقصود یہی معیت کا تھا۔ کہ صبر ہو۔

(معیت) معیت کے معنی ”ساتھ ہونا“ موسیٰ علیہ السلام نے حضرت کی جناب میں عرض کیا (هَلْ اَتَّبِعَكَ) تیرے ساتھ رہوں۔ اور پھر حضرت کا جواب كُنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَابِرًا۔ (تم میرے ساتھ نہ رہ سکو گے)

کو نوا مع الصادقین سے مراد

یہ حکم قرآن پاک میں ہے كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (بچوں کے ساتھ رہو) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ لِي مَعَ اللَّهِ وَقْتُ لَا يَسْعُنِي فِيهِ مَكَاتٌ مُقَرَّبٌ وَلَا نِيٌّ مُرْسَلٌ (مجھے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ایسا وقت معیت کا نصیب ہونا ہے۔ کہ کسی مقرب فرشتہ یا مرسل نبی کو بھی اس وقت پسند نہیں کرتا۔

طریقت میں پہلی منزل صبر اور دوسری رضا ہے

صبر تو کیا تسلیم و رضا ہونی چاہیے تھی۔ اور تسلیم و رضا بھی اس پر جس کی بابت علم نہ ہو۔ بلکہ اس علم کے برخلاف اندرونی جذبات ہوں۔ یہ طریقت کی ابتدائی بنیاد ہے۔ اور اسی تعلیم کے لئے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) حاضر کئے گئے تھے۔

قرآن حکیم میں کُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ”کہ تم سچوں کے ساتھ رہو“ کا حکم صریح ہے اس حکم پر جن بزرگوں نے عمل کیا۔ وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت ہی نے صحابہ کو کیا سے کیا بنا دیا

صحابہ کرام کی دولت کیا تھی۔ یہی معیت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم۔ پہلے وہ کیا تھے کنوارے تھے۔ بدوی تھے لیکن چند دن کی معیت نے انہیں خدا سے ملا دیا۔ حکیم بنا دیا۔ عالم بنا دیا۔ جو کسی کے خیال میں نہ آتا تھا۔ وہ ان کے دل پر القا ہونے لگا۔ اور دنیا میں وہ کچھ ہو گئے۔ جو کسی بڑی سے بڑی درس گاہ کے اندر نہیں بسر کرنے سے نہ ہو سکتا تھا۔ فرماں برداری اور فرماں روائی دونوں میں وہاں جا پہنچے۔ جہاں کسی زمانے میں بھی ان کے ہم پلہ ہونے کا خیال تک نہیں آتا

کامل کی معیت سب کچھ بدل دیتی ہے

غرض طریقت کی تربیت میں معیت کو بڑا درجہ نصیب ہے۔ اکثر عارفین نے اپنے خواص کو ایک عرصہ تک اپنے ساتھ رکھا۔ اور شب و روز کی معیت

نے ان کے اخلاق و عادات و افکار کو بدلتے ہوئے میں حیرت انگیز اثرات دکھائے۔

معیت میں تربیت کا طریقہ

پہلے زمانے میں خود مرشد ایک جگہ رہنا پسند نہ فرماتے تھے جیسے حضرت علیہ السلام کے قصہ سے پتہ چلتا ہے۔ اور حلیے کتب تصوف میں اکثر اولیائے کرام کے حالات میں آتا ہے۔ خود بھی چلتے تھے اور خادم خاص بھی ساتھ رہتے تھے یہاں تک کہ ان کو کامل خیال کر کے ان کو کسی مقام میں رہنے کا حکم فرماتے۔ یا کسی طرف کوچ کرنے کا ارشاد ہوتا لیکن جب کسی بزرگ نے قیام فرمایا تو پھر معیت کے سبق دلانے کے لئے۔ خانقاہی طریقہ اختیار کیا۔ سالک جاتے۔ اور سالوں خدمت میں رہ کر معیت کے فوائد اٹھاتے۔ اور کامل بنتے۔

خانقاہیت کی حقیقت

آج کی دنیا میں بیکار خانقاہوں پر نظر ڈالتے ہوئے بعض علماء اعتراض کرتے ہیں۔ اور خانقاہی تصوف کو برا خیال کیا جاتا ہے لیکن اصل حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ خانقاہی طریقہ کوئی آج کا نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چلا آتا ہے۔ اصحابِ صفہ کیا تھے۔ اور کیوں دربار رسالت سے چمٹے رہتے تھے۔ اور کیوں نان صدقہ پر گزارا کرتے۔ کیا بیکاری تھی یا کوئی خاص مشغل محبت الہیہ تھا۔ محبت الہیہ کیا کچھ کم مشغل ہے۔ خود سوچئے۔ سچی محبت اپنے سوا کچھ کرنے دیتی ہے؟ یا کچھ سننے یا دیکھنے دیتی ہے؟ پھر کوئی محبت کا مارا بیکار، اپنی نظر اس قدر متوجہ نہ کرتے

بیمکاری سے وقت گزارے۔ تو ملامت کیسی۔ جب کسی دنیاوی یا حسینی محبت پر وقت ضائع کرنا خیال نہیں کیا جاتا۔

دنیا عجیب ہے۔ اغراض۔ جو سرسر خود پرستی کے سوا کچھ نہیں ان خواہشات کے پورے کرنے میں جو وقت صرف کیا جاتا ہے۔ اسے عین شغل حیات خیال کیا جاتا ہے۔ اور شغل روحی زندگی کی نازگی کا باعث ہے۔ اسے عبث اور بے کاری خیال کیا جاتا ہے۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

محبت کا جب وقت آتا ہے۔ تو سب کچھ ہیچ نظر آتا ہے۔ نبی مرسل اور فرشتے کتنے بلند درجہ کے ارواح عالم ہیں لیکن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا وقت ہوتا تھا۔ تو کسی کی گنجائش نہ ہوتی۔ فرماتے ہیں۔ **لِي مَعَ اللَّهِ وَقْتُ لَا يَسْعَى فِيهِ مَلَكٌ مُقْرَبٌ وَلَا نَبِيٌّ مُرْسَلٌ**۔ کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ایسا وقت محبت نصیب ہوتا ہے۔ کہ کسی فرشتہ یا نبی مرسل کے لئے میرے پاس ان کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

جو ہوا ہے سب کچھ مصلحت ہے

بہر صورت حضرت علیہ السلام نے معیت کی اجازت دیدی۔ تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس دولتِ معیت سے فائدہ اٹھائیں۔ گو وہ جانتے تھے۔ کہ جس کی انہیں خبر نہیں۔

اور جس چیز کا انہیں علم نہیں دیا گیا اس پر کیسے خاموش ہو سکیں گے۔ حالانکہ مطلوب بھی یہی تھا۔ کہ بلاچون و چرا تسلیم و رضا کے مجسمہ بن جائیں۔ اور حکم الہی اور مشیت ایزدی کو سرسرِ حکمت خیال فرماتے ہوئے طرہِ حقیقت کے مصالح پر عبوری نظرِ حال کر لیں۔

مصاحبت سے بڑھ کر اور کچھ نہیں

سو طرہِ حقیقت کے اسباق حاصل کرنے کے لئے جو درجہِ معیت کو حاصل ہے وہ اور کسی چیز کو نہیں اس لئے طالبِ رُشد کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ اپنے مرئی اور اپنے مُرشد کی معیت حاصل کرے۔ اور مصاحبت میں اپنی پوری ہمت صرف کرے۔

ایک لطیفہ

قاضی ثناء اللہ بانی پتی سے کسی نے آپ کی عمر دریافت کی۔ تو آپ نے فرمایا۔
تین سال۔ سننے والا حیرت میں آگیا۔ کہ حضرت کیا فرماتے ہیں۔ آپ کا سن تو بہت
گذر چکا ہے۔ جواباً کہا کہ میری عمر وہی ہے جو پیر کی خدمت میں میں نے گذاری باقی
وقت عمر کا ضائع کرنا تھا۔ جو سالک اپنا وقت پیر و مرئی کی خدمت میں گزارتا ہے
وہ اس دولت سے مشرف ہوتا ہے جسے خاقانی نے بایں الفاظ ادا کیا۔

ع کہ یکدم با خدا بودن بہ از ملک سلیمانی

با خدا بودن کی اصل حقیقت

با خدا بودن کو اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ اللہ زبانِ یادوں

سے کرنا اور یا خدا برون ہے لیکن یہ سراسر نادانی و ناواقفی ہے۔ "با خدا برون" کیا ہے
 یہ معیشت اور مصاحبت الہیہ ہے۔ ایک طرف مولیٰ کریم اور دوسری طرف بندہ
 اکٹھے بیٹھے جب نظر آویں۔ تو اسے معیشت کہا جاتا ہے۔ ویسے تو خدائے قدوس
 کی معیشت ہر چیز کے ساتھ ہے لیکن یہ معیشت خاصہ تو کسی کو نصیب ہوتی ہے قرآن
 حکیم نبی کریم کی زبان سے بولتا ہے۔ لَا تَخْزَنُ رَأْسُ اللَّهِ مَعَنَا صَدِيقٌ الْكَبِيرُ كُوْفَرًا
 جاتا ہے۔ یہ وہ معیشت نہیں۔ جو ہر آن اور ہر حال کائنات میں جاری و ساری ہے
 جس کا علم کسی کو نہیں دیا جاتا۔ بلکہ یہ وہ معیشت ہے جس کا علم صاحب معیشت کو
 دیا جاتا ہے یعنی تیزوں اکٹھے تھے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ۔ رسول اکرم صلی اللہ
 علیہ وآلہ وسلم اور اللہ جل شانہ غار میں بیٹھا اکٹھے تھے۔

معیشت کے آثار موجود ہوتے ہیں

شیخ کی معیشت و صحبت میں یہ دولت سالکین کو حاصل ہوتی ہے اور برابر حاصل
 ہوتی رہتی ہے۔ جن لوگوں کو یہ معیشت طریقت نصیب ہوتی۔ ان کے مشاہدات و
 کیفیات قوم میں موجود ہیں۔ انہیں مظاہرہ فرما کر دل کو ٹھنڈا کیا جاسکتا ہے۔

معیشت موسوی

ویسے تو قرآن میں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ معیشت بہت ہی کم رہی۔ یعنی
 ایک دن میں۔ لیکن جیسے عام قصص قرآن حکیم میں مدت کا ذکر نہیں۔ اور واقعات
 اکٹھے دیکھنے، پڑھنے والا خیال کرتا ہے۔ کہ کافی جانی ذکر ہے۔ لیکن واقعات کے مشاہدہ

کرنے والے جانتے ہیں۔ کہ سالوں کے واقعات کے بیان میں جب ایک گھڑی دکھاتے ہیں۔ تو پڑھنے والا جانتا ہے کہ درمیان میں وقفہ نہیں۔ جیسے بنی اسرائیل کے واقعات کو جب یکساں پیش کیا جاتا ہے۔ تو سالوں کے عرصے اور مدت کا پتہ تک نہیں ملتا۔ اسی طرح یہ سیر میرے خیال میں ایک کافی عرصہ کا پتہ بھی کوئی واقعہ پیش آیا۔ اور کبھی پھر سفر کے بعد دوسرا۔ غرض یہ تین سفر الگ الگ ہیں اور ہر سفر کا ختم ایک واقعہ پر ہوتا ہے۔ اس لئے یہ معیشت اچھی خاصی رہی۔ چونکہ تعلیمی اسباق کا تعلق خاص کر واقعاتِ عجیبہ سے تھا۔ اور ذکر ہوئے اور دیگر اذکار چھوڑ دیئے گئے۔ اور اصل مطلب واقعہ کو بیان کر دیا گیا۔ مثلاً قتل کو ہی لیا جاوے۔ تو یہ ایک لفظ ہے۔ لیکن قتل کرنے کا واقعہ کوئی اتنا مختصر نہیں۔ جتنے کہ الفاظ اس لئے میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ کہ کئی دنوں یا مہینوں کی معیشتِ خضریٰ رہی۔ واللہ اعلم۔

”فانطلقاً“ کا لفظ اسی پر ولالت کرتا ہے۔

اسباقِ تربیت کی غرض و غایت

کسی مفکر نے یہ نہیں لکھا۔ کہ ان واقعاتی اسباق سے حضرت موسیٰ کو کیا تعلیم و تربیت دلائی مقصود تھی۔ عام مفکرین تو صرف یہی لکھتے ہیں۔ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے زیادہ علم ہونے کا خیال آیا۔ تو حضرت بازمی عزرا سے ان کے اس گمان کو غلط کرنے اور اپنے خاص اومیوں سے تعارف دلانے کے لئے ان کو خضریٰ تعلیم دلائی۔ اور خضر کے پاس روانہ کیا۔ تاکہ اپنے اور ان کے علم کا مقابلہ کر کے عنایتِ ازلیہ کا شکر یہ ادا کریں۔ کیونکہ علمی حیثیت خضر

کی کتنی بلند تھی! اور دوسری علم ان کے مقابلہ میں کتنا کم تھا لیکن منصب نبوت کی بلندی حضرت ولایت سے کتنی بلند تھی۔ کیا بات ہے! ایک کا علم زیادہ ہے لیکن منصب ولایت سے آگے قدم نہیں! اور ایک منصب نبوت پر بیٹھ کر ایک امت کا امیر ہوتا ہے لیکن ایک صاحب ولایت سے علم میں کم۔ یہ اس سرکار عالی کی فیاضی اور اس کی حکمت بے پایاں جس تک عقول نہیں پہنچ سکتے۔

۵ گاہ چناں بنماید و گاہ ضدایں جز کہ حیرانی نباشد کار دین

اصل دین کیا ہے؟

اصل دین یہی ہے کہ اس کے کارخانہ قدرت سے حیرانی پیدا ہو جاوے اور اس کی ذات اقدس کی حکمت کے سوا کچھ نظر نہ آئے۔

۵ زیر کی بفسر و ش وحیرانی سخن
گوش خسر بگذار و دیگر گوش خسر

توحید تشریحی سے توحید تکوینی کی جانب سفر

اور یہ اسباق کی غرض لم یذلی تھی یعنی توحید تشریحی سے توحید تکوینی کا سبق دینا مطلوب تھا۔ اور ظاہر سے آنکھ بند کر کے باطن کی آنکھ کو روشن کرنا تھا۔ اور ہر فعل الہی اور مشیت ایزدی کو سر اسر حکمت دکھانا مقصود تھا۔ ایک طرف نبی بھیجے تو دوسری طرف شیطان الرجیم کو کھڑا کر دیا۔ اور یہ کیوں؟ سر اسر حکمت، سر اسر مصلحت۔ اور جب تک یہ مصلحت عام سامنے نہ کرتے اس وقت تک توحید تکمیل نہیں ہوتی۔

یہ خواص کا منصب ہے عوام کا نہیں

اچھے آدمیوں کو جب اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے۔ اور ان کو اپنا خاص بنا تا چاہتا ہے۔ تو اپنی حکمتوں اور اپنے ارادوں سے ان کو مطلع کر دیتا ہے۔ تاکہ ان کی آنکھیں اس کے کسی فعل کی بُرائی نظر نہ آئے۔ اور یہ ہے مسلمانوں۔ اور اس درجہ پر ہر انسان کو لانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ عوام و خواص میں پہلے تو فرق چاہیے۔ اور دوسرا عوام کو عوام کے لئے چھوڑ دیا۔ کہ دنیا کے رصند سے کریں۔ اور خواص کو اپنی بارگاہ کے مقرب بنا کر اپنے کار خاص کے لئے منتظر حکم و فرمان بنایا۔

ولایت کی حقیقت

اور یہ ہے اصل غرض و غایت طریقت۔ کہ جن کو اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں چن لے۔ اُن سے یہ دوسرا کام لیا جاتا ہے۔ جو خاصہ مقربین کا ہے۔ اسی کا نام دوسرے الفاظ میں ولایت ہے۔ اور ولی اللہ کے نام سے جو منسوب ہوتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو مرکز انسانیت ہوتے ہیں۔ تمام انسانیت کی فلاح کے سرچشمے یہاں سے اُبلتے ہیں۔ اور تمام انسانی ہستی اچھی ہو یا بُری۔ ان سے فیضیاب ہوتی ہے۔

طبعی مناسبت

طبعی مناسبت جب تک کسی انسان میں نہ ہو اُنس پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ مناسبت ظاہری امور سے تعلق نہیں رکھتی۔ یہ باطنی جذبات میں مناسبت ہوتی

ہے۔ اندرونی جذبات جب ایک ہوں۔ اور مشاغل ہلکے الگ۔ تو جذباتی اتحاد ایک نقطہ پران کو قائم کر دے گا۔ اور اگر مشاغل ایک ہوں یعنی ایک شغل میں ایک گروہ کاہم کرتا ہو لیکن اندرونی جذبات یا کیفیات۔ یا عقاید دینی الگ ہوں۔ تو وہ کبھی اتحاد و اتفاق کے مرکز شغل میں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ یعنی شغل انہیں ایک نہیں کر سکتا ایک طرف کام اور شغل ختم ہوا۔ دوسری طرف بھاگ کر شروع ہوئی۔ بحسلاف طبعی مناسبت کے جب موقع اپنے مشاغل سے ملے گا۔ اتحاد و اتفاق کی مجلس گرم ہو جائے گی۔ اور اپنے اندرونی جذبات کی تشنگی بھلنے کے لئے ایک دوسرے سے محبت اور اخلاص کی باتیں کریں گے۔ اور تمام ایک دوسرے کے ہم آہنگ نظر آئیں گے۔

ظاہر باطن ایک ساتھ نہیں چل سکتے ایک ضرور غالب ہوگا

موسے علیہ السلام کو حکم خداوندی سے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور بڑی مشت سبابت اور بڑی کڑی شرائط پر مصاحبت کو حاصل کیا تھا لیکن دونوں میں مناسبت طبعی نہ تھی۔ ایک صاحب شریعت تھے۔ اور دوسرے صاحب تکوین۔ اس لئے باوجود حکم الہی اور باوجود مقصد بلند رکھنے کے موسے علیہ السلام سے نبھاؤ نہ ہو سکا۔ حضرت تو خود جانتے تھے کہ یہ نبھاؤ ان سے مشکل ہے لیکن وہ بھی حکم خداوندی پورا کرنے اور اصل حقیقت مناسبت دکھانے اور تشریح و تکوین کے اختلافات ظاہر کرنے کے لئے بظاہر راضی ہو گئے۔ اور اپنے ساتھ لے چلے لیکن ہر موقع پر دونوں کی جھڑپ ہوتی گئی۔ اور آخر مناسبت باطنی نہ ہونے کی وجہ سے ہذا فراق

بَدِيْعِي وَبَيِّنَاتٌ، کہہ کر الگ الگ ہو گئے۔ اس الگ ہونے کا نہ تو حضرت کو رنج تھا۔ اور نہ موسیٰ علیہ السلام کو پریشانی تھی۔ اگر قلبی مناسبت ہوتی۔ اول تو الگ ہونے کا خیال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اگر اسباب قدرتی پیدا بھی ہو جاتے۔ تو عمر بھر دونوں کو رنج ہوتا۔ کہ ہماری مصاحبت اور رفاقت پر کیا بلا پڑی۔ کہ دونوں کو جدا کر دیا۔

مُرید کی سیر پیچھے طبعی مناسبت سے آنا فانا کامل بناتی ہے

یہی حال طریقت کی مناسبت کا ہے۔ جب پیر و مرشد اور مرید کی مناسبت ہوتی ہے۔ تو مرید آنا فانا ترقی کرتا ہوا آخری درجہ محبت پر پہنچ جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں ”یٰ مَعَ اللّٰهِ وَقَتُّ“ کی کیفیت اپنے اندر پاتا ہے۔ لیکن جب مناسبت نہ ہو۔ تو بیعت کا فائدہ ڈالنے کے باوجود۔ اور اوراد و ذکر کو ادا کرنے کے ساتھ بھی مرید ایک قدم آگے نہیں بڑھتا۔ کیونکہ جب تک مرید کی طبیعت انوار مرشد کے قبول کرنے کا مادہ جذب نہ رکھتی ہو۔ انوار مرشد کی شعاعیں اندر سے اٹھتی ہی نہیں۔

علم اور چہیز ہے اور فقر کی استعداد اور

آپسے یہ نہیں دیکھا۔ کہ بعض صاحب علم بعض صاحب طریقت حضرات کی خدمت میں جاتے ہیں۔ اور ان کے فرمودہ کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں لیکن وہ اپنے اندر ان کیفیات کو نہیں دیکھتے۔ جو ان کے دوسرے پیر بھائی اپنے سینہ کے اندر دیکھ کر بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا علم کچھ نہیں ہوتا۔ اور یہ قرآن و حدیث کے

واقف اور عالم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے۔ کہ جس کو ظاہر کے ساتھ زیادہ مناسبت ہے۔ اس کو باطن کے ساتھ کم ہوتی ہے۔ اسی طرح جسے باطن کے ساتھ مناسبت زیادہ ہو۔ وہ ظاہر کے ساتھ کم متعلق رکھتا ہے۔

ظاہر و باطن کا استخراج

انسان جسم و جان کا مرکب ہے۔ جسم بلا جان کچھ نہیں اور جان بلا جسم دکھائی نہیں دیتی۔ اور اس کے حرکات و افعال اور ارادہ و کیفیات نظر نہیں آتے۔ ایسے ہی علم ظاہر (شرعیات) علم باطن (طریقت) کا لباس ہے۔ طریقت اس لباس کے سوا کچھ نہیں۔ جب تک کہ یہ لباس جلوہ نمائی کے لئے طریقت کی جان پر نہ ہو اور بمنزلہ جسم دکھائی نہ دے۔

اور ایسے ہی علم شرعیات۔ علم طریقت کے سوا بے جان ہو جائے گا۔ علوم شرعیہ کو کتنی بلندی پر اٹھایا جائے۔ اور اس کے اعمال پر کتنی سختی سے پابندی کیوں نہ کی جاوے لیکن جب تک علم باطن کی روشنی اس کے جسم شرعیات کے اندر روشن نہ ہوگی۔ تب تک اعمال و افکار بے فوق، بے نور نظر آئیں گے۔ اور دیکھنے والے پر کچھ اثر نہ ہوگا۔

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام

میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

ایسے ہی طریقت کے اصحاب جب اپنے جسم شرعیات کے لباس سے

خالی اور ننگے ہو جاتے ہیں۔ وہ برہنہ برہنہ نظر آتے ہیں۔ ان کی آنکھ جیسا سے خالی

ہو جاتی ہے۔ اور اس لئے روشنی اپنے گلوب شیشہ عکاس کے نہ ہونے کی وجہ سے
 نہایت مدہم بلکہ ہوا کے جھونکے ہر وقت اس کی لٹا یعنی شعلے کو لڑزاں کرتے
 رہتے ہیں۔ اور خوف ہوتا ہے۔ کہ ہمیں یکدم کسی ایک جھونکے سے بچو نہ جائے۔

شرعیات جسم ہے اور طریقت جان

اس لئے جیسے جسم کے لئے جان۔ اور جان کے لئے جسم کی ضرورت ہے۔
 ایسے ہی شرعیات کے لئے طریقت اور طریقت کے لئے شرعیات کا لباس اور
 جسم ضروری ہے لیکن علمائے ظاہر اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ کہ شرعیات سے آگے
 کچھ نہیں۔ سچ بنے کچھ نہیں لیکن شرعیات کے اندر طریقت برابر دکھائی دیتی ہے۔
 قرآن حکیم اور اسوۂ حسنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برابر دونوں کی خبر دیتے ہیں۔
 شرعیات کو با جان کرنے کے لئے یہ روح ضروری ہے۔ یہ کوتاہ نظری ہے کہ اس کی
 طرف دھیان نہیں دیا جاتا۔

ایک حقیقت

آپ موجودہ مفسرین کی تفاسیر کا مطالعہ کیجئے۔ جہاں ظاہری شرعیات کے
 آیات حکمت آتے ہیں۔ وہاں صفحے کے صفحے آپ کو بھرے پڑے نظر آئینگے۔
 لیکن جہاں طریقت کے آیات متشابہات آجادیں گے۔ وہاں متشابہات
 کہہ کر آگے خاموشی سے نکل جائیں گے۔ بلکہ متشابہات کا لفظ بھی میں نے بڑھا
 دیا۔ بس دم کھینچ کر قدم آہستہ اٹھاتے ہوئے پار نکلتے ہیں۔ کہ ہمیں اس و لدل

طریقت میں پھنس نہ جائیں۔

صاحبِ علم کب صاحبِ حال بنتا ہے

ایسے حال میں ان کی طریقت کی ہوا نہ لگے۔ اور طریقت ان کے ذہن میں نہ آئے
 تو کیا عجب! پھر دیکھا دیکھی جو جانتے بھی ہیں۔ وہ بھی اپنے علم کے زعم میں کچھ حاصل
 کرنے کے درپے نہیں ہوتے ہیں۔ بہت کم صاحبِ علم ایسے ہوتے ہیں جو باطنی
 مناسبت سے تزکیہ کی دولت سے سرفراز ہونے کے بعد طریقت کے اندر
 چل نکلتے ہیں۔ یا بعض مرشد طاقتور اتنے ہوتے ہیں کہ اپنی پہلی نظر سے علم کو کھسا
 جاتے ہیں۔ اور ہستی کو غیبتی میں بدل دیتے ہیں۔ اور پھر اپنے عکسی انوار سے طریقت
 کا حال ان پر وار کر دیتے ہیں۔ اور وہ من و تو سے فارغ ہو کر علالِ رب العزت میں
 غرق ہو نکلتے ہیں۔ رومی فرماتے ہیں۔

علم را بر تن زنی مارے بود علم را بر دل زنی یارے بود

طریقت و شریعت کا فرق بس یہی ہے اگر شریعت کے اندر روشنی توحید و رسالت چمک
 اٹھے تو یہ علم یار ہے اور اگر قلب و نظر میں یہ روشنی پیدا نہ ہو تو پھر یہ شرعی علم ایک سانپ
 ہوتا ہے۔ جو دل کو دستار ہتلا ہے جس سے نہ تو کسی کو فائدہ ہوتا اور نہ اپنے دل کو
 کوئی آرام پہنچتا ہے۔

ایک سوال

شاید آپ کو یہ خیال پیدا ہو جاوے۔ کہ پھر طریقت حاصل کرنا ہر صاحبِ
 شریعت کے لئے ضروری ہے؟ نہیں عاشا و کلا۔ طریقت تو ایک وہی نعمت

ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔ اس میں کسی کو دخل نہیں۔ اور اس کے لئے کوئی مسلمان
مسکلف نہیں۔

طریقیت کیوں ضروری ہے

ہاں! اس کی روشنی سے متاثر ہونا اور اس کی روشنی سے روشنی حاصل کرنا
ضروری ہے۔ یعنی ان کے انعکاس سے قلبی ہدایتوں کے اندر اثرات حاصل
کرنا ضروری ہے۔ تاکہ قلبی ہدایات اپنے پورے اثر سے جلوہ گر ہو کر شریعت الہیہ
کو پورے طور پر قائم کریں۔ اور شریعت کے انوار روشن ہوں۔
جیسے تمام انسانوں کے لئے ایم۔ اے کرنا ضروری نہیں۔ بلکہ کچھ نہ کچھ علم حاصل
کرنا ضروری ہے جس سے اس قدر استعداد ہو جائے۔ کہ ایم۔ اے والوں کے علم سے
فائدہ اٹھایا جاوے۔ خواہ کتنا ہی کم ہو۔

اس لطیف فن میں کامیاب کون ہو سکتا ہے

ایک صاحبِ طریقیت لاکھوں انسانوں کے لئے کافی و شافی ہوتا ہے۔
اور وہ لاکھوں سے کوئی ایک ہو سکتا ہے۔ جو تمام علائق کو پس پشت ڈال کر اللہ
تعالیٰ کے لئے اپنے جسم و جان کو قربان کر دے اور اپنے من و دھن کو ذاتِ سہما
اَمْوَالِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ فَتَنَّاكُم کے مطابق فتنہ خیال کرے اور اس
سے تلبیٰ طیر پر جدا ہو۔ اور صحیح معنوں میں فتنہ خیال کرے۔ عطارؒ کیا خوبی اور
مزے سے فرماتے ہیں۔

مال و اولاد ت بمعنی دشمن اند گریز نزدیک تو چشم روشن اند

انما اموالکم رایادگیر مال و ملک دولتت بربادگیر

ایسے لوگ صاحبِ طریقت ہی ہو سکتے ہیں۔ جو سب کچھ اللہ کے نام پر قربان کر کے زندگی و عمر تک بیٹھتے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ ننگے معنی برہنہ ہوتے ہیں بلکہ دنیاوی تعلق سے ننگ دل کو صاف بلوہائے الہی کے لئے تیار کئے بیٹھتے ہیں۔ اور دل آگاہ رکھتے ہیں۔ مشہور مقولہ ہے۔

فیض حق تاگاہ برسد لیکن بر دل آگاہ برسد۔

ایکے جانِ خطر

ہمارے علم دوست حضرات کو یہ کہنے سے منع کرنا چاہئے کہ اگر طریقت اور اس کے بعض اعمال نامناسبہ پر ہم ایمان لائیں گے۔ تو شریعتِ خطرے میں پڑ جائیں گی۔ اور حدودِ اللہ کو توڑنے کا جواز خواہم و عوام کو ہاتھ لگ جائے گا۔ اور یہ اتنا بڑا فتنہ ہے جس کو کسی صورت پر نہ درست کہا جاسکتا ہے۔ اور نہ بند کیا جاسکے گا۔ اس لئے ہم اس فتنہ کی روک کے لئے اصل طریقت کو بے جان کر دیں۔ تاکہ یہ فتنہ پیدا نہ ہو۔

متنازع مسائل کی حقیقت

اس کی مثال بعینہ یہ ہے۔ اہل تقاریر سے استمداد کو نا بائز قرار دینے والوں نے جب دیکھا کہ لوگ اس سے باز نہیں آتے۔ تو انہوں نے شریعتِ نثر اور

سے اللہ تعالیٰ کا فیض اچانک آتا ہے لیکن جسے وار دل پکاتا ہے۔

علوم اسلامیہ سے ایک اور قدم بڑھا کر صاف کہہ دیا۔ کہ وہ مٹھی ہو چکے۔ وہ کچھ سنتے نہیں۔ جب سنتے ہی نہیں تو دست بردار کیسی۔ یہ کتنی کمزوری ہے۔ کہ ایک امر متنازع فیہ کو روکنے کے لئے ایک حقیقت مسلمہ اسلام سے نکال کر دیا جائے جیسے احادیث اور قرآن حکیم اور اسوہ حسنہ پر کچھ بھی عبور ہے۔ وہ کیسے سماعِ موتے کا انکار کر سکتا ہے۔ ایک نہیں سینکڑوں احادیث اس کے لئے کتب احادیث میں موجود ہیں بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کہ پہلے ادیان میں یہ مسئلہ برزخی زندگی اتنا واضح نہ تھا۔ جتنا اسلام نے واضح کرنے کی کوشش کر کے واضح فرما دیا۔

شریعت کے حدود واضح ہیں

اس کے علاوہ طریقتِ خواہے کتنی ہی غلابازیاں دکھائے۔ شریعت اپنے حدود اور اہم میں اتنی واضح ہے۔ کہ کسی کی ہمت نہیں بوسکتی۔ کہ ان حدود کو توڑنے میں طریقت کو پیش کرے۔ جو طریقت کے امورِ صالحات کے لئے کچھ ایسے دکھائی بھی دیتے ہیں۔ تو وہ انہی تک محدود ہوتے ہیں۔ عام امت پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔ بلکہ طریقت کے ماننے والے خود تسلیم کرتے ہیں۔ اس سے کوئی جواز کسی دوسرے کے لئے نہیں نکلتا۔

مجاذیب شریعت کا ادب کہتے ہیں

اہلِ جذب جو اصحابِ طریقت نہیں۔ بلکہ مجذوب کہلاتے ہیں۔ وہ کبھی منہ سے ایسے الفاظ نہیں نکالتے۔ جس سے شریعت کی تحقیر و تذلیل ہو۔ یا وہ کسی کو اس

۱۔ یعنی خود صاحبِ اعلیٰ تک۔

تذلیلِ شریعت پر ابھاریں۔ یہ الگ ہے کہ ان کے حال سے کسی دوسرے پر بھی وہ حال وارد ہو جائے۔ اور وہ مرفوعِ نطقِ سلم کے عکس سے اسی کا نمونہ ہو بیٹھے۔ لیکن اس کی بھی کیا مجال، کہ ایک حرف وہ ایسے لغویات کا منہ سے نکالے۔

لباسِ فقیر میں شریعت کی تذلیل کرنے والے معاش ہیں

ہے وہ بد معاش، جو لباسِ فقیر میں شریعت کی تذلیل کرتے ہیں۔ ان کی طرہیت کا پول دنیا کے سامنے ہوتا ہے۔ اور انہیں صاحبِ طرہیت بھی پوری حقارت سے دیکھتا ہے۔

نہ ہر کہ سر بتر اشد قلندری واند

نہ ہر کہ آئینہ وارو سکندری واند

کا مضمون دنیا کے افہام اور فہموں میں برابر کو بجا رہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نفسِ امارہ کے بزخا اور متکبر ایسا کہہ دیں مگر ہمیشہ ان کی تواضع جوتوں سے ہوتی چلی آئی اور ہوتی چلی جائے گی۔

الراستخون فی المسلم کون ہیں

اس لئے اہل حق جن کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اور جو اس کے آیات بیانات پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ کبھی گھبراتے نہیں۔ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ

۱۔ ہر وہ شخص جو سہرے سنڈ وادیتا ہے ظنہ نہیں بن سکتا۔ اور ہر وہ شخص جو آئینہ رکھتا ہو سکندری نہیں بن سکتا۔

يَقُولُونَ أَمْثَابِهِ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ أَلاَ
 أُولُواْ أَلْبَابًا ترجمہ :- اور علم میں پختہ لوگ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے ہیں۔
 ہر چیز (معاملہ) ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔ اور عقل والے اس سے
 نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ دیکھئے کس فصاحت سے اللہ جل شانہ نے اس مطلب کو
 ہمارے سامنے واضح فرما دیا۔ کہ وہ ایسے متشابہات سے گھبراتے نہیں بلکہ ان پر ایمان
 لاتے ہیں اور کھلے الفاظ میں ”اَمْثَابِهِ“ (ہم اس پر ایمان لائے) کہہ دیتے ہیں۔ اور
 پھر فرماتے ہیں۔ یہ ایمان ہی ایمان نہیں ہوتا بلکہ اہل علم اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور
 نصیحت پکڑتے ہیں۔ تذکیر کیا جیتے ہیں؟ خود ہی فرماتے ہیں۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ
 عالیہ میں التجا کرتے ہیں۔ مَا بِنَا لَا تَزِيغُ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا
 وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ
 ترجمہ :- اے اللہ ہمارے دلوں کو ہدایت کے بعد رنگ آلودہ نہ فرما۔ اور اپنی رحمت
 ہمیں بخش کیونکہ تو تو وہاب بخشہار ہے۔

اہل شریعت اور اہل طریقت کا اختلاف مٹ سکتا ہے

ہاں یہ الگ بات ہے۔ کہ ہمارے اہل علم کو اتنی فرصت ہی کہاں جو ایسے
 آیات بیسیئات پر توجہ فرمائیں۔ اور اس کے نتائج سے آگاہ ہوں۔ یہ سنی سنائی
 بات پر ایمان رکھتے ہیں۔ اپنا تدبر اور اپنی فکر قرآن پاک میں نہیں لڑاتے۔ ورنہ یہ
 جنگ وجدل اہل طریقت اور اہل شریعت کے ختم ہو جاتے۔ اور ایک ”بُنْيَانٌ
 مَّرْصُوعٌ“ کی طرح باطل کا مقابلہ کرتے۔

فسخ نسبت

معاہدین کی جب طبیعتیں بدل جاویں۔ تو معاہدہ ہمیشہ ٹوٹ جاتا ہے۔
 طریقت کا معاہدہ بہت نازک ہے۔ نکاح کے معاہدہ کو توڑنے کا حق صرف
 مرد کو اسلام میں دیا گیا ہے۔ اور عیسائیت میں عورت کو اور ہندو مذہب میں
 یہ معاہدہ کسی صورت میں ٹوٹتا نہیں لیکن معاہدہ طریقت، مرید کے عقیدے میں
 جب نازل آجائے۔ اور اپنے مرشدِ عالی کو کسی وجہ سے بھی ناقص یا کم اخلاق۔
 یا کم نظر خیال کرے تو فوراً معاہدہ ہوا ہو جاتا ہے۔ اور بعض وقت مرشدِ عالی
 جب مرید کو دیکھتا ہے۔ کہ اسے مناسبت نہیں۔ یا اس کے احکام طریقت کو پورا
 نہیں کر سکتا یا اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی عقیدت میں حسن ظن نہیں رہا۔ تو وہ
 خود اسے الگ کر دیتا ہے۔ اور اسے واگزار کر دیتا ہے۔ کہ جہاں اس کا نصیبہ
 ہو۔ وہاں طریقت کے ثمر کھائے۔ یا اپنے لایعنی خیال میں سہ گرواں رہے۔ گویا خود
 بری الذمہ ہونا چاہتا ہے۔

جب نبھاؤ نہ ہو سکا تو نتیجہ ظاہر ہے

جیسے پہلے لکھا گیا ہے۔ موائے بھی جب اپنا نبھاؤ نہ کر سکے۔ اور دیکھ چکے
 کہ نبھاؤ مشکل ہے۔ تو خود ہی کہہ دیتا تھا۔ اِنْ سَأَلْتُمْ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَ هَذَا
 فَلَا تُصَاحِبُونِي۔ (اب اگر میں کچھ پوچھوں۔ تو پھر مجھے ساتھ نہ رکھنا)

دوسری طرف حضرت بھی دیکھ چکے تھے تشریح و تکوین کا مساویانہ امتزاج مشکل ہے۔ میں کچھ اور دیکھتا ہوں اور وہ کچھ اور سمجھتے ہیں اس لئے آخری مرتبہ فرمایا "هَذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ" غرض معاہدہ بیعت ختم ہو گیا اور اپنی راہ چلنے لگے۔

بد عقیدہ مرید کا انجام

طریقت میں اکثر ایسے ہی پیدا آتا ہے۔ کہ جب مرید بد عقیدہ ہو گیا تو خود بیٹھ گیا۔ اور حاضری پیر سے رہ گیا۔ اور اگر پیر مرشد نے کمی دیکھی تو خود جواب دیدیا۔

تربیت کامل سے غیر اللہ کی محبت دل سے نکل جائے

حضرت ٹٹھی رحمۃ اللہ کے مخلص جو ضرور وغیرہ کرانے کی خدمت میں اپنے اخلاص کی وجہ سے آفتاب بروار تھے۔ ایک بار کسی مخلص دوست سے ذکر کیا۔ کہ میں اگر فلاں سے نکاح ہو جائے۔ تو کیا ہی اچھا ہو اس مخلص نے موقع پا کر حضرت کی خدمت میں عرض کر دی۔ حضرت نے فرمایا۔ ہاں! وہ ایسے چاہتا ہے۔ عرض کی آپ کی مہربانی! آپ خاموش ہو گئے لیکن جب وہ سحری کے وقت وضو کرانے کے لئے خدمت میں حاضر ہوا۔ تو حضرت نے پوچھا۔ کیوں بیان نکاح چاہتے ہو؟ جواباً کہا نہیں۔ پھر دوسری رات ایسے ہی دریافت کیا۔ غرض اس وقت تک پوچھتے رہے جب تک کھلا اس نے اقرار نہ کیا۔ پھر فرمایا کس سے۔ پہلے تو ایسے گول رکھا لیکن

علیٰ حضرت اعلیٰ غلام نبی ٹٹھی۔ جو حضرت غلام محی الدین قصوری رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔
اور اللہ شریف ضلع جام میں تفریم تھے۔

آپ کے اصرار سے بتلا دیا۔ آپ نے کچھ ناراضگی کا اظہار نہ کیا۔ بلکہ متانت طبعی بدستور رہی لیکن صبح نماز کے بعد حلقہ عارادت سے فارغ ہوئے۔ تو سارا مجمع مخلصین حاضر تھا فرمایا دو اچھے مضبوط آدمی باہر آجاویں۔ چنانچہ حکم پاتے ہی دو مضبوط خادم سامنے کھڑے ہو گئے۔ آپ نے فرمایا کہ فلاں کے کان پکڑ لو۔ اور اللہ کی حدود سے باہر چھوڑاؤ۔ جب وہ لے چلے۔ تو بعد میں مجمع سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ کبھی بھی کوئی شخص اس کی سفارش مجھ سے نہ کرے۔ خیر وقت گیا اور گیا۔ تقریباً آٹھ سال گزر گئے۔ آپ جانتے ہیں۔ جب کوئی سالک کسی درگاہِ ارادت سے دھتکارا جاتا ہے۔ تو اس کا خستہ حال کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ آخر کسی پرانے دوست کو رحم کیا۔ اور اس نے بارگاہِ عقیدت میں عرض گزاری کہ اب تو اس پر رحم فرمایا جاوے۔ اس کی حالت اتنی خراب ہو گئی ہے۔ کہ دیکھی نہیں جاتی۔ آپ نے فوراً فرمایا کہ کوئی اس کی سفارش نہ کرے۔

جب استعداد ہی نہ تو تو پیہر کیا کرے

پھر فرمایا مجھے اس سے کوئی دشمنی نہیں اس نے سب سے بڑی بڑی خدمت کی تھی لیکن جب میں نے دیکھا۔ کہ آٹھ سال کے اندر اس کے دل سے عورت کی محبت میں نکال نہیں سکا۔ تو اب میں نے سوچا۔ کہ میں کیوں اس کا وقت ضائع اس کام میں کروں۔ یہ جس چیز کا اہل ہے اس کام کو جا کر سنبھالے۔ غرض مرشدِ حق کسی کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا اور نا اہل کو خاتما سے نکال دیتا ہے۔

قصہ حضرت موسیٰ و خضر کی آیات اور ان کی تشریح و توضیح آپ پڑھ چکے ہیں، اور وہ حقیقت
 طرفیت جو پیش کی گئی ہے، امید ہے کہ آپ کے ذہن میں آپہنکی ہوگی اور طرفیت و شریعت کے اس
 عقیدے میں ہونگے کہ طرفیت شریعت کی جان ہے لیکن جیسے ایک انسان کا جسم اور روح الگ
 الگ زیر بحث آتے ہیں اسی طرح شریعت و طرفیت الگ الگ زیر نظر آتی ہیں اور دونوں کے مسائل
 بھی الگ الگ ہیں اور الگ الگ توضیحات اور الگ الگ استناد

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کے طبع اور استعداد و ملاحظہ کر چکے نبوت اور ولایت کی دونوں
 نشانیں دیکھ چکے تشریح ابتدا ہے اور تکوین انتہا ہے۔ دوسری طرف تکوین روح ہے اور تشریح جسم۔
 جسم ہر ایک کو نظر آتا ہے لیکن روح کی حقیقت سے کوئی واقف نہیں اگر ہے بھی تو آثار اور نشانات سے۔
 مذہب کی بنیاد حقیقی طرفیت پر ہے اور ثمرہ شریعت ہے اور اس ثمرہ شریعت کے لئے تم طرفیت
 ہونا ضروری ہے جب تک یہ تم پوری قوت کے ساتھ دل میں نہ ہو شجرہ شریعت اپنی تکمیل کو نہیں پہنچتا
 اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانا پہلے ہے اور اس کے بعد اس کے احکام شریعت پر چلنا ہے ذات
 جب تک مشاہدہ میں نہ آئے ایمان کیسے قائم ہو اس نکتہ کو اور واضح کرنے کے لئے چند آیات قرآنی
 آپ کی تفسیر کے لئے پیش کرنا ہوں مثلاً :-

۱۱) وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ

جب تک یہ حقیقت ثابتہ کسی کے سامنے نہ آئے کیسے وہ اللہ کو غنی خیال کر سکتا ہے اور غنی
 اپنے لئے کیسے خیال کر سکتا ہے یعنی غنا اللہ کے لئے اور فقر اپنے لئے

۱۲) وَاللَّهُ يَسْجُدُ مِنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ

یہ کیسے شریعت سے کھل سکتا ہے کہ تمام زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ہے
 ایسے ہی سجدہ اللہ ما فی السموات والارض "جب تک اپنے کانوں سے کوئی ان کی تسبیح نہ سنے
 کیسے تسبیح کر سکتا ہے کہ ہر چیز مولیٰ کریم کی تسبیحات پڑھ رہی ہے علیٰ ہذا القیاس مندرجہ ذیل آیات
 قرآنی اور ان کے مطالب صرف "اعلموا انہم" سے بغیر "بیزکیم" کے کیسے ذہن نشین ہو کر ایمان
 کے درجہ پر پہنچ سکتے ہیں "یتلو علیہم آیتہم ویزکیمہم ویعلمہم الکتاب"

یزکیمہم مقیم ہے اور یعلمہم بعد میں

۱۳) وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ

۱۴) وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ

- (۳) واللہ علی کل شیء قدير
 (۴) نحن اقرب الیہ من جبل الورد
 (۵) واللہ بکل شیء علیم
 (۶) واللہ بکل شیء بصیر

یہ بنیادی عقیدے توحید کے ہیں جب تک ان پر کامل ایمان نہ آئے توحید کا تم پر وہ ان میں چڑھتا
 اسی لئے نبوت کی نیابت کے لئے ولایت کی استعداد قائم فرمائی گئی تاکہ ہر دور میں نبوت کا مشاہدہ
 تقویت پاتا رہے اور تقلید کو مشاہدہ کی روشنی پہنچتی رہے اور صاحب تقلید مشاہدہ کی روشنی کے نور کامل
 یقین میں رہے

یہ نبوت کی استعداد ہے اور نبوت کی استعداد کا جب کامل ہو تو اور عکس کسی صاحب استعداد
 پر پڑتا ہے تو یہ عکس وہ تمام کچھ سامنے کر دیتا ہے جو سراسر حقیقت ہوتی ہے جس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
 کی دعا ہے

اللہم ارنا حقائق الاشیاء کما ہی

اب یہ 'کما ہی' اس چیز کی حقیقت دیکھنے اور سامنے آئینا نام طرقت ہے اور یہ استعداد ہی حقیقتاً
 فطرۃ اللہ ہے جس پر مذہب کی بنیاد ہے ربنا لاتفرغ قلوبنا بعد از
 ہدیتنا وھب لنا من لدنک رحمة

یہ آیت مبارکہ بھی ہمارے مقصود و مطلوب کو واضح کرنے کے لئے کافی و شافی ہے

استعدادِ علمی اور حسیز اور استعدادِ روحانی اور دولت ہے اگر استعدادِ روحانی نہ ہو تو یہ ضروری نہیں
 کہ استعدادِ روحانی کا انکار کر دیا جائے کتاب کا یہ حصہ اب ختم کیا جاتا ہے جو گوشہ مرشد کے ذریعہ کا
 نمونہ تھا اور دوسرا حصہ بلا مرشد جو رشد دلایا جاتا ہے اس کو اسی سورہ کہف قصہ اصحاب کیف سے
 پیش کیا جاتا ہے اگر آپ مکرر سہ کڑ میری تحریر پڑھیں گے تو انشاء اللہ تعالیٰ وہ تمام مطالب سامنے
 آجائیں گے جن کو آپ دیکھنا چاہتے ہیں ۛ

طریقہ کی حقیقت

قرآنی آیات میں

حصہ دوم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

رَبِّ اَشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْ اَمْرِيْ

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوا قَوْلِيْ

پہلے حصہ طریقت میں لکھا گیا ہے۔ کہ قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام - قصہ اصحاب کہف اور قصہ ذوالقرنین میں یہ مشابہت ہے۔ کہ یہ پاک نفوس نبیؐ تو نہ تھے لیکن اللہ تعالیٰ کے نہایت نیک بندوں سے ہو گزرے۔ جن کی زندگیاں ہمارے لئے مشعل ہدایت بن گئی ہیں۔ اور قرآن حکیم مثالی طور پر ان کو بیان کر کے ان کے علم و رشد سے ہدایت کے سبق سکھلاتا ہے۔ یہ تمام قصے سورہ کہف کے اندر جمع کر دیئے گئے۔ اور کسی نبیؐ کا اصالتاً ذکر نہیں کیا گیا۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر تبعاً آگیا ہے۔

قرآن حکیم جہاں قوانین فطرت اور احکام شریعت پیش کرتا ہے۔ وہاں ساتھ

ساتھ تبشیر اور انذار، (خوشخبری اور خوف) سے عمل پر لانے کا طریقہ بھی جاری رکھتا ہے۔ تاکہ فطرتِ سلیمہ کے اندر اس کے احکام کی تعمیل کا جذبہ پیدا ہو۔ اور اس کے مناہی سے بچنے کے لئے وہی طور پر تیار ہو جائے۔

سورہ کہف کی ابتدائی آیتوں کو پڑھئے۔ تاکہ واضح ہو جائے۔ کہ ان قصص کی غرض و غایت کیا ہے۔ اور مقصود کیا ہے فرماتے ہیں :-

اللہ کی تعریف ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری۔ اور اس کے اندر کوئی کجی نہ رکھی۔ نہایت ٹھیک ڈرائے ایک سخت مصیبت اور انبوالی آفت۔ اور خوشخبری دے یقین لانے رکھنے والوں کو جو نیک کام کرتے ہیں۔ ان کے لئے نہایت اچھا اجر (معاوضہ) ہے جس کے اندر ہمیشہ رہیں گے۔ اور ڈرائے ان کو جو یہ کہتے ہیں۔ کہ اللہ نے صاحبزادہ بنا لیا۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيَّ
عَبْدِي فِي الْكِتَابِ وَلَمْ يَجْعَلْ
لَهُ عِوَجًا ه قِيمًا لِيُنذِرَ بَأْسًا
شَدِيدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ
الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ
الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا
حَسَنًا مَّا كَثُورٌ فِيهِ
أَبْدَانٌ وَيُنذِرَ الَّذِينَ
قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا ه

چونکہ ہمارا تعلق حصہ تبشیر (یعنی بشارت والوں) کے ساتھ تھا۔ اس لئے دوسرے حصہ کو چھوڑ کر ہم اپنے متعلقہ حصہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور دوسرے حصہ (انذار) کو چھوڑتے ہیں۔ حالانکہ اصل مقصود وہی ہے۔ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا۔ یعنی ایسے بڑے عقیدہ کی بیخ کنی کرنی۔ جو عقلاً نقلاً کسی طرح بھی ممکن ہو توغ نہیں کہ خالق و مخلوق کے تعلق کے باوجود والد و مولود کا تعلق ہو سکے۔ جس کی عقید

کہ لئے بَأْسًا شَدِيدًا مِّنْ لَّدُنْهُ کی وعید سخت سنائی گئی۔ اس
 لکھے لئے دیکھئے اقادات گیلانی (مطبوعہ الفرقان لکھنؤ) تاکہ اس وعید کی حقیقت
 آپ پر روشن ہو۔ کہ یہ تکمیل ہو رہی ہے۔

رشد

رشد کے عنایت کرنے کے دو طریقے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے
 ہیں۔ ایک تو بلا واسطہ۔ جیسے پہلے قصہ خضر و موسیٰ میں بیان ہو چکا ہے۔
 کہ خضر کو رشد بلا واسطہ حاصل تھا۔ لیکن اس کے حاصل ہونے کا طریقہ وہاں
 نہیں دیا گیا۔ اور وہ ہے مِّنْ لَّدُنْهُ اس کی ذات سے بلا واسطہ "قصہ
 اصحاب کہف میں اسی عنایت کا مفصل ذکر آیا ہے۔ کہ کیسے ان کو اعلیٰ درجہ
 کے رشد پر پہنچایا گیا۔ یہ ایک مثالی نمونہ ہے۔ اس پر جتنا غور کیا جائے اتنے روز
 کنایات ہیں۔ بلکہ واضح صورت سامنے آجائے گی۔ گذشتہ اور قدیم مفسرین نے صراحتاً
 اس سے ایک معجزہ دکھانے کا کام لیا ہے لیکن حقیقتاً معجزہ سے بڑھ کر ایک سبق
 طریقت ہے۔ جو اہل اسلام کو دیا گیا ہے۔ کہ ایک ایماندار اپنا ایمان کہاں تک
 بلند کر سکتا ہے۔ اور کس درجہ پر اپنے یقین کو لیجا یا جاتا ہے۔ اور کس طرح کے
 فضل اور اکرام ایسے ایمان اور رشد پر عنایت ہوتے ہیں جن کے لئے یہ الفاظ
 "أَجْرًا حَسَنًا" مَا كَثُرْنَ فِيهِ أَبَدًا" فرمائے گئے۔ یہ الفاظ کون کون
 قیمت نہیں رکھتے۔ بلکہ ایسے گراں بہا سعادہ کی خبر دیتے ہیں۔ جو اہل دنیا کو
 کبھی نصیب نہیں ہو سکتے۔ خواہ وہ دنیا کے خطوں کا مالک ہی کیوں نہ ہو جائے

کب تک چلتے ہیں؟۔ چند سال نہیں تو چند صدیاں سہی اس سے آگے ان کا قدم نہیں نکلتا لیکن یہ معاوضے۔ اس دنیا سے نکل کر اگلی دنیا کے اندر اس سے بھی بڑھ کر سرسبز و شاداب ہوں گے۔ دنیا میں دیکھتے نہیں یہ کب کا واقعہ ہے۔ اور اس وقت سے لیکر آج کی دنیا تک برابر ان کو زندگی ملی ہوئی ہے۔ اور اتنے طویل عرصہ میں اپنے ذکر کی روشنی دنیا میں پھیلا ہے ہیں۔ اور اس روشنی کو ایک روشنی کے مینا کی حیثیت کتب سماویہ سے حاصل ہو گئی۔ اور قیامت تک یہ مینا اپنی روشنی دیتا رہے گا۔ اور ہر آنے والی نسل اس سے سبق حاصل کرے گی۔ اور نور ہدایت پائے گی۔ اور قرب مولیٰ کے لئے یہ مینا ہدایت ایک سیر صلی کا کام دے گا۔ اور پاک فطرتیں لذتِ قرب حاصل کریں گی۔ اور دینِ فطرت کے لئے ایک مثالی نمونہ بنیں گی۔ جیسے اصحاب کہف آج مثالی طور پر سامنے کئے گئے ہیں۔ کل آنکھوں کے سامنے وہ زندہ مثالیں اور مشعلیں روشن امت محمدیہ کے سامنے ہوں گی۔ جن کا اجر، معاوضہ سے ان کو بھی ملے گا۔ جن کے نقش قدم پر چل کر ہم دنیا میں سُرخرو ہوں گے۔

اصحابِ کہف کی مختصر کہانی

عیسوی ظہور کے بعد دقیانوس بادشاہ بت پرست تھا۔ شہر انسوس میں چند نوجوان جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید سے حصہ بخشا تھا۔ اُس کے خوف سے۔ کہ کہیں ہمیں بتِ بجا ری بنا کر ہمارے ایمان ضائع نہ کر دے۔ چپکے سے شہر سے نکل گئے اور اپنے ایمان کے بچاؤ کی خاطر ایک کھف (کھوہ) کے اندر جا پہنچے۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے کی قدرت سے وہ سو گئے۔ اور جب جاگے۔ اور بھوک محسوس

ہوئی۔ اور اپنے ایک ساتھی کو کھانا لانے کے لئے بھیجا۔ تو بازار میں اس سگہ کو دیکھ کر لوگ حیران رہ گئے۔ کیونکہ دقیانوس کے زمانے کو کئی صدیاں گزر چکی تھیں۔ جب زیادہ پوچھ گچھ اس سگہ لانے والے سے کی گئی۔ تو آپ نے دقیانوس کا زمانہ بتلایا۔ لوگ اس پر حیران ہو گئے۔ اور بادشاہ وقت جو اس وقت دین عیسوی قبول کر چکا تھا۔ اور موٹھا تھا اس کے سامنے لے گئے۔ اس نے جب اپنا قصہ سنایا۔ تو لوگوں کو اس کہف اور ان آدمیوں کا قصہ جو پہلے لوگوں سے سنتے آئے تھے۔ یاد آیا۔ اور حیران ہو کر رہ گئے۔ خود اصحاب کہف کو بھی پتہ نہ تھا۔ کہ کتنا وقت گذر گیا ہے۔ بلکہ ان کے خیال میں ایک دن یا دن کے کچھ حصے کا خیال ہی تھا۔ قرون اور زمانوں کا خیال تو کجا۔ وہ خود اور باقی تمام دنیا اللہ تعالیٰ کی اس حکمت اور معجزہ سے حیران رہ گئی۔ اور اللہ تعالیٰ کے ایجاب و ابعاث (پیدا کرنا اور نئے سرے سے چلانا) کی قدرت کو پا گئے۔ اور وہ ایمان لانے والے ہو گئے۔ پھر اس جگہ پر نشان قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ اور بعض وہ ایماندار جو ان سے ایمانداری نسبت سے تعلق رکھتے تھے۔ دوسرے لوگوں کی رائے پر غالب آ گئے۔ اور مسجد بنانے کا فیصلہ کیا۔ اور وہ ایک مدت تک نشان باقی رہا۔ اب بھی بعض کا خیال ہے۔ کہ وہ سوتے ہیں۔ اور جب تک دنیا قائم ہے۔ سوتے رہیں گے۔ اور ان کے پانسے (جانتے سمی) فرشتے چھ ماہ کے بعد الٹ دیتے ہیں۔ تاکہ جسم گل اور سڑ نہ جائے۔

اب یہ قصہ اور کہانی ذہن نشین کرنے کے بعد قرآن حکیم کی آیات کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ یہ کہانی قرآن حکیم سے اخذ کی گئی ہے۔ لیکن بعض الفاظ کا صحیح مفہوم نہ جانتی ہونے کی وجہ سے مفسرین قرآن کچھ ایسی روش پر چلے ہیں۔ کہ بجائے

کہانی کھلنے کے ایک معجزہ یا چہستان یہ کہانی ہو گئی ہے۔ چنانچہ موجودہ مفسرین تو ایک عجب پریشانی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اور ایسی بوکھلاہٹ سے دوچار ہوئے کہ قرآن حکیم کا اصل مقصد جو رشد و ارشاد تھا۔ وہ گم ہو گیا۔ اور وہ ہمت میں الجھ کر رہ گئے۔ میں خود بھی ان کو پڑھ کر بعض وقت حیران ہوا۔ اصل وجہ وہی تھی۔ کہ ان کو روحی تعلق باسدر نہ تھا۔ وہ عقلی ڈھکوسلوں کے پیچھے اندھا دھند چلتے تھے لیکن تاہم دنیا میں۔ اہل اتقا موجود ہیں۔ جن کی بصیرت افزا تحریریں بعض وقت نازک سے نازک مسئلے پر پوری ہدایت کا کام کرتی ہیں۔ اگرچہ ان تحریرات کے پڑھنے کے بعد پوری حقیقت واضح نہ ہوئی۔ لیکن تدبیر کی راہ نے بہت کچھ حصہ کے مطالب روشن کر دیئے ہیں۔ جو سراسر اربابِ طریقت کے لئے موزوں نظر آئے۔ اور پلاریب یہ وہ کچھ ہیں۔ جو علمائے ظواہر کے سوچنے کے لئے ایک اہم ترین حقیقت روشن کریں گے۔

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ
الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ كَانُوا
مِنَ آيَاتِنَا عَجَبًا
کیا تو خیال رکھتا ہے۔ غار اور
کھوہ والے ہماری قدرتوں میں
اچنباتے تھے۔

ایک دوسرا ترجمہ: کیا تم سوچتے ہو۔ کہ اصحابِ کھف اور رقیم کے ہماری نشانیوں میں کوئی اچنبے کی بات ہے؟

الکھف | اکثر نظریات کا اختلاف الکھف اور الرقیم کے
والرقیم | واضح معنی سامنے نہ آنے کی وجہ سے ہوا۔ اور الکھف کا
ترجمہ غار کر لیا گیا۔ حالانکہ غار کچھ اور ہے۔ کھف کچھ اور۔ غار پہاڑ کے اندر

ہوتی ہے۔ اور ایک دروازہ ہوتا ہے۔ اور باقی طرف سے بند ایک سوراخ کی شکل میں۔ بخلاف کہف کے۔ یہ پہاڑوں کی دیواروں میں گھری ہوئی ضرور ہوتی ہے لیکن چھت بند نہیں ہوتی۔ بلکہ آسمان نظر آتا ہے۔ اور اکثر ایک طرف سے کھلا راہ رکھتی ہے۔ خواہ کتنا تکلیف دہ بھی ہو۔ یعنی وہ بھی سطح زمین سے بہت بلند۔ یا برابر۔ گاہ اندر سے بہت لمبی چوڑی ہوتی ہے۔ اور اکثر لمبی تو ہوتی ہے۔ لیکن چوڑائی میں کم۔ اصحاب کہف کی۔ الکہف۔ معلوم ایسا ہوتا ہے۔ کہ لمبی تو بہت زیادہ تھی لیکن چوڑی کم تھی۔ جس کا فیصلہ خود قرآن حکیم آگے جا کر دیتا ہے۔ پنجابی زبان میں پٹھری اور اردو زبان میں کھوہ اُسے کہتے ہیں۔

الرشقیہ | المرقوم۔ لکھا ہوا کے معنی ہیں۔ بعض نے تو اس سے کتبہ مراد لیا ہے۔ جو کہتے ہیں۔ کہ اصحاب کہف کے اندر داخل ہونے کے بعد شاہ وقت نے لگوادیا۔ تاکہ ایک نشان قائم ہو جائے۔ اور بعض نے الرقیم سے کتاب پیغمبر وقت مراد لی ہے۔ اور یہ ہیں ہمارے بزرگ مناظر احسن گیلانی مرحوم بہر صورت الکہف کے معنی نہ واضح ہونے کی وجہ سے بعض بڑے بڑے مفسر مغالطہ میں رہ گئے۔ اور پھر بہت من گھڑت باتوں سے خیال کو پورا کرنا پڑا۔ ہم انشاء اللہ اپنی طرف سے کچھ کہنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ خواہ کوئی مطلب یا کہانی واضح ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ ہمیں تو قرآن حکیم سے اس کی بصیرت و ہدایت سے سبق لینا ہے۔ اور بس۔

كَانُوا مِنْ آيَاتِنَا عَجَبًا | ایک معنی تو یہ ہیں۔ کہ تُو اے مخاطب ہماری بڑی نشانیوں سے یہ نشانی خیال کریگا۔ لیکن ہمارے پاس اس سے بہت بڑھ کر پیدائش و

خلق کے نمونے موجود ہیں جس کے سامنے یہ مسیج ہے۔

دوسرے :- ایک گندے اور شرکانہ ماحول سے چند آدمیوں کا اس طرح نکل آنا۔ کہ گھر بار چھوڑ کر راہِ موتی میں چل دیتے ہیں۔ اور کوئی سہارا نہیں لیتے۔ اور صرف ذاتِ اقدس کے سہارے دنیا کو ترک کر دیتے ہیں۔ اور خالی دعا پر ہاتھ اٹھائے نظر آتے ہیں۔ اور اس کے سوا کچھ سہارا نہیں رکھتے جس کی تفصیل خود بارگاہِ قبولیت یاسی الفاظ فرماتی ہے :-

جب جا بیٹھے وہ جوان اپنی کھوپڑی
پھر دعا کرنے لگے اسے ہمارے رب
ہمیں اپنی رحمت خاصہ سے نواز۔ اور
ہمارے معاملہ کو درست فرما۔

إِذَا دَعَى الْغَائِبَةَ إِذَا الْكُفُوبِ
تَسَالُوتِ رَبِّنَا إِنَّا نَسْت
لَدُنْكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا
مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا

دعا کے جملے۔ دعا کے اندر دو فقرے یا دو جملے ہیں۔ لیکن کیا غضب کے۔ ساری دنیا کی عنایات۔ نصرتیں اور شفقتیں اس کی لپیٹ میں آجاتی ہیں۔ رحمت۔ یوں تو موزائے کریم کی رحمت ہر آن اور ہر گھڑی اس کی تمام مخلوق پر برس رہی ہے۔ لیکن جب یہ لوگ دنیا سے کٹ آئے۔ اور تمام وسائل دنیا کو ترک کر کے آئے۔ تو اب یہ صرف رحمتِ خاصہ کے طلبگار ہیں۔ کہ اس کی رحمت کے سہارا زندگی بسر ہو جائے گی۔ اور دنیاوی اسبابِ معیشت پر تنگی نہ آئے۔

اَمْرِنَا رَشَدًا | دوسرا لفظ رَشَد۔ امرنا کے ساتھ لگا کر وہ کچھ طلب کر لیا۔ جو دنیا اور مابعد دنیا کے لئے ضروری تھا۔ یعنی اپنے عمل کا سدھاؤ یعنی ٹھیک ٹھاک۔ ہمیشہ کے لئے اور آئندہ کے لئے۔ اور سدھاؤ کون کرے ؟ -

دیکھئے دعا کتنی جامع ہے۔ لیکن عنایت کیا ہو اور قبولیت کے الفاظ

کیا ہیں۔

پھر تھپک دئیے ہم نے ان کے کان
اس کھوہ میں۔ گنتی کے کئی برس پھر
اس کے بعد ہم نے ان کو اٹھایا۔
کہ معلوم کریں دونوں فریقوں میں کس نے
یاد رکھی مدت رہنے کی۔

فَضَرَبْنَا عَلَىٰ اُذُنِهِمْ فِي
الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا
ثُمَّ بَعَثْنَا لَهُمْ لِنَعْلَمَ
اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا
لَبِثُوْا اَمَدًا

یعنے کانوں سے ہرے کر دئیے گئے۔ اور وہ بھی ایک لمبی مدت تک جس کی یاد
بھی لوگوں سے اٹھ گئی۔ مولائے کریم حکیم نجیر۔ علیم ہیں۔ ظاہراً تو بہرا ہونا کچھ اچھی بات
نہیں لیکن غور کریں۔ تو اس راہ کے لئے جس پر وہ چلے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ملنے
کی راہ۔ اور معرفتِ الہیہ کا راستہ۔ اس کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا
چاہیئے تھا۔

گوش بندگی جب کان بند ہو جاتے ہیں۔ تو خود بخود بولنا کم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مخاطب
خطاب کے بعد تکلم میں آتا ہے۔ اور تکلم بنتا ہے۔ لیکن جب کچھ سُننے ہی نہیں۔ تو
خاموش ہو جاتا ہے۔ اور خاموشی دل کی بصارت اور روشنی کو تیز کرتی جاتی ہے
اور دل کے اندر فیوضاتِ الہیہ جوش کھانے لگتے ہیں۔ وہ دولت جو سالوں میں
حاصل نہیں ہوتی۔ وہ گھنٹوں میں میسر ہو جاتی ہے۔ اور مولائے کریم کے ساتھ
تعماری دستِ گوشتی اور بات چیت بڑھ کر۔ ہر قسم کے یقین اور تسلی کا باعث

ہوتی ہے۔ اور تسلی و یقین ہی وہ دولت ہے۔ کہ جب آجاوے۔ تو ہر قسم پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں۔ اور تمام سامانِ معیشت سے نظر اٹھ جاتی ہے۔ کادروا زہ ایسا کھلتا ہے۔ کہ غیبی رزق آنا شروع ہو جاتا ہے۔ کان کیا بنے ہوئے۔ ہر طرح اطمینان و آرام کی دولت گویا مہیا کر دی گئی۔ اور وہ لوگ باطنی زندگی پوری کرنے لگے۔

گننتی کی یاد یہاں تک کہ کسی کو پتہ تک نہ رہا۔ کہ کتنے سال و ماہ گذر گئے ان کو خود یعنی اصحابِ کھف کو۔ یا ان کو اور باہر والوں کو۔ یعنی باہر کی دنیا کو کہ کتنا عرصہ گذر گیا ہے۔ غرض ایک طویل مدت گذر جانے کی وجہ سے ایسا فرمایا گیا۔ کہ جب آرام ملتا ہے۔ تو گننتی کے ایام کم معلوم ہوتے ہیں۔ اور لمبا عرصہ بھی کم خیال میں آتا ہے۔ یہی حال یہاں اصحابِ کھف کا ہوا۔ کہ کسی ایک کو اس مدت طویل کا خیال تک نہ آیا۔ دن رات گذرتے گئے۔ اور یہ لوگ اپنی لگن یادِ الہی میں مست تھے۔ نہ اپنا خیال تھا۔ نہ غیر کا۔ نہ اپنی پہلی زندگی کا وقت ذہن میں رہا۔ نہ موجودہ زندگی کھف کی کا امساک کچھ تکلیف دہ تھا۔ غرض ایک بہشت کی زندگی ہو گئی تھی۔ جس کے اندر سال و ماہ کا شمار نہیں۔ اور یہ کیوں۔ صرف یادِ الہی اور اسرارِ الہیہ کی مدہوشی میں۔ اور مستی میں وقت گذر گیا۔

قصہ کے اجمال اور اختصار کی وجہ

مخاطب کو جب ”کَانُوا مِنْ آيَاتِنَا عَجَبًا“ کی آواز کان میں پہنچتی ہے۔ تو مخاطب کا اشتیاق بڑھ جاتا ہے۔ اور قصہ کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جاتا ہے۔

کی کریم جو فطرت انسانی کا خود خالق ہے۔ جانتا ہے۔ کہ تشویق کو کیسے ابھارا
 ہے۔ تو ایک مختصر سا بیان فرما دیا۔ جو صرف دو آیات پر مشتمل ہے۔ دُعا
 پر جواب دُعا۔ جس سے مخاطب اس کی تفصیل پر ابھرتا ہے۔ اور تفصیل کے لئے
 نیاب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قصہ اصحاب کہف میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا۔ اب
 مخاطب ہمہ تن گوش ہو کر رہ جائے گا۔ اور تفصیل سامنے آنے پر اس کی حیرت اور
 تعجب کی کوئی انتہا نہ رہ جائے گی۔ چنانچہ اس اجمال کے بعد تفصیل کی طرف قدم
 اٹھاتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں۔

خانقاہیت

علم والے خانقاہیت کے نام سے کھڑتے ہیں۔ اور اہل علم خانقاہی
 زندگی کی بابت جس تحقیق و تدبیر کا رویہ رکھتے ہیں۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔
 بلکہ بار بار فرماتے ہیں۔ یہ اسلام پسند نہیں کرتا۔ یہ رہبانیت ہے۔ جسے دُور
 کا تعلق بھی اسلام سے نہیں۔ دنیا اور دنیا کے نظام میں جو نہیں۔ اس نے اسلام کو
 سمجھا ہی نہیں۔ لیکن معلوم نہیں ہوتا۔ کہ وہ کیوں ایسی آیات پر غور نہیں کرتے۔
 جن میں خانقاہی زندگی کو صرف پسند ہی نہیں کیا گیا۔ بلکہ کَانَوَا مِنْ اٰیٰتِنَا
 عَجَبًا ان خانقاہی زندگی والوں کے لئے فرمایا گیا۔ کیا خانقاہی زندگی اس کے
 سوا کچھ اور ہوتی ہے؟ کیا یہی بعینہ نقشہ نہیں ہوتا۔ کہ دنیا اور اہل دنیا سے کٹ
 کر ایک الگ گوشہ میں بیٹھے یا والہی میں مشغول رہتے ہیں۔ نہ تن کا فکر ہے۔ نہ
 کھانے پینے کا خیال۔ لباس و رہائش پہلے ہی ختم کر کے نکلتے ہیں۔ اور اسی ایک

کے ہو کر گھر سے باہر قدم رکھتے ہیں۔ پھر وہی ضَرْبْنَا عَلَیْ اِذَا نِهْمُرْ کے مطابق کسی سے کچھ سننا پسند نہیں کرتے۔ اور اپنے خیال میں مست گنگناتے رہتے ہیں۔ اور اللہ کی شان۔ کہ ان کے کھانے پینے کے سامان خورد و خورد حسب منشاء قدرت "نہیا ہوتے رہتے ہیں۔ عمریں گذرتی ہیں لیکن کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ اپنی دنیا بسائے بیٹھے نظر آتے ہیں۔

پہلے قصہ کے اجمال اور بعد کی تفصیل کی وجہ

جب کسی مخاطب کو کسی عجیب امر یا قصہ کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے۔ تو پہلے متکلم اس کے عجوبہ ہونے کا ذکر کرتا ہے۔ تاکہ مخاطب پوری توجہ دے۔ اور اس کے بعد ایک مجمل سا خاکہ پیش کر کے مخاطب کی طبیعت کو ابھارتا ہے۔ تاکہ اس کی تفصیل کے لئے اس کا اشتیاق و گناہ تگنا ہو جاوے۔ بعینہ ہی حال ہمارے اس قصہ کا ہے۔ پہلے مولائے کریم نے كَانُوا مِنْ اٰیَاتِنَا عَجَبًا فرما کر مخاطب کو اس قصہ کی طرف متوجہ کیا۔ پھر ایک اجمالی خاکہ سنا کر مخاطب کو پورے اشتیاق سے متوجہ ہونے پر ابھارا۔ چنانچہ اجمالی آیات کے بعد اب تفصیلی آیات شروع ہوتے ہیں۔

ہم ان کا حال ٹھیک ٹھیک سناتے ہیں۔ وہ کئی جوان یقین اپنے رب پر لائے۔ اور ہم نے اور ہدایت ان پر بڑھا دی۔ اور ان کے دلوں کو خوب جوڑ

فَحْنُ نَقْصُ عَلَیْكَ نَبَاہُمْ
بِالْحَقِّ اِنَّہُمْ فِتِیۃٌ اٰمَنُوْا
بِرَبِّہُمْ فَرِزْدْنَاہُمْ هُدٰی
وَدَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِہُمْ اِذْ قَامُوْا

فَعَالُوا رَبُّكَ السَّمَوَاتِ
وَالْأَرْضِينَ لَنْ نُنْزِلَهُنَّ
دُونَهُنَّ إِلَهًا لَقَدْ قُلْنَا
إِذَا شَطَطْنَا

وینا باندھ دیا اور مضبوط کر دیا۔ جبکہ وہ
کھڑے ہوئے اور پکار اٹھے۔ کہ ہمارا
رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔
اس کے سوا ہم کسی کو خدا نہ پکارینگے

اگر ہم ایسا کہیں گے۔ تو عقل سے دور کی بات کہیں گے۔

تشریح | اس ملک کی آبادی تمام کافر تھی۔ اور یہ چند جوان محض فضل الہی سے موحد
ہو بیٹھے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ کہ اندر سے فطرت نے انہیں توحید پر مجبور کیا۔ یا
کسی واسطہ سے ہوئے۔ بعض اقوال میں ہے۔ کہ دین عیسوی کے ابتدائی ایام
تھے۔ اور کسی طرح دین عیسوی کی دعوت ان تک پہنچ گئی۔ اور وہ ایمان لے
آئے۔ لیکن اس صورت میں جب ایمان لائے۔ تو مولیٰ کریم کی خاص مہربانیوں کے
مورد ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت خاصہ سے سرفراز فرمایا۔ وہ ہدایت
خاصہ کیا ہے؟۔ وہ ہے شرح صدر۔ اور نور قلب جس پر براہ راست فیوض
رحمانی وارد ہوتے ہیں۔ غرض ایک ایمان تو پہلے تھا۔ لیکن اس ایمان کے ساتھ
ایک اور ہدایت شامل ہو گئی۔ اور وہ ایمان پورے یقین کے درجہ پر پہنچ گیا۔

ایمان بڑھتا ہے

مشربیت غیر ایمان لانے کے بعد جب کوئی سلوک میں قدم رکھتا ہے۔ تو اسی
طرح ایمان ترقی کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ یقین کے آخری درجہ پر پہنچ
جاتا ہے۔ بعض اہل علم طریقت اور راہ سلوک کو بے فائدہ خیال کرتے ہیں۔ وہ خود

اس جملہ پر خیال فرمادیں۔ ایمان کے بعد یہ کیا درجہ آگیا۔ جس کے لئے یہ جملہ مولا نے کریم کو بڑھانے کی ضرورت آئی۔ **وَزِدْنَا هُمْ هُدًى**۔ سبحان اللہ مولیٰ کریم کی جس پر یہ مہربانی بلا واسطہ ہو۔ وہ کتنی مہربانی ہے۔ اور وہ کتنی ہدایت ہوگی۔ جو ایک کافر دنیا کے مقابل ہونے کے لئے تیار ہوگئی۔ اور بر ملا اپنے یقین اور ہمت اور توحید کی مناد می کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔

پھر فرماتے ہیں۔ اس ہدایتِ مزید پر جب ہم نے دیکھا۔ کہ وہ اعلان کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ تو ہم نے ان کے دلوں کو اور مضبوط کر دیا۔ اور کھلا اعلان کروا دیا۔ **لَنْ تَدْعُوا مِنْ دُونِهِ**۔ اس کے سوا کسی کو نہیں پکار سکتے۔ یا نہیں پکاریں گے۔ اور اگر ایسا کریں گے۔ تو عقل سے دور کی بات ہوگی۔ سوچئے بادشاہ کافر۔ حکومت کافر۔ رعایا کافر۔ غرض تمام ماحول کفر سے بھر پورا اور ہر طاقت ان کے ساتھ۔ مال و اقتدار کے سوا کثرت افراد کی طاقت لیکن جب یہ اللہ کے بند سے پوری طرح ایمان لے آئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان پر خاص ہدایت کے انوار پھینک دیئے۔ اور جب وہ اعلان کے لئے تیار ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو اتنا مضبوط بنا دیا۔ کہ کسی کے خوف کا خیال تک نہ آیا۔ یہ ایمان کی آخری دولت ہے۔ ساری دنیا ایک طرف۔ اور یہ چند افراد صاحب ہدایت ایک طرف۔ اقبال نے خوب کہا۔

عشق ہو مصلحت آمیز تو ہے خام ابھی

ولایت | یہ دولت ولایتِ ربی تک پہنچاتی ہے۔ اور یہ ہی ایمان ہے۔
اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ

اس وقت تمام حقائق کفر و نور سامنے آجاتے ہیں۔ اور کفر کی کوئی صورت بھی پوشیدہ نہیں رہتی۔ اندھیرا اندھیرا ہو کر نظر آتا ہے اور نور نور۔ ہر ایک دوسرے سے الگ۔ اس وقت صاحبِ ولایت قربِ الہی میں تیزنا پھرتا ہے۔ اور دنیاوی آلائشوں سے پاک ہوتا ہے۔ تبھی تو کہتے ہیں۔ کہ اگر کسی دوسری ہستی کا خیال بھی کریں گے۔ تو عقل سے دوری کی نشانی ہے۔ ورنہ ان جیسے لاکھوں انسان اپنے کفر میں مدہوش عقل کی صورت سے کفر کو پسند کئے ہوئے تھے۔ اور اپنے کفر پر نازاں تھے۔ اور موحدینِ خدائی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کہ آخر ان مٹھی بھر جانوں کو ان سے جان بچانے کے لئے پہاڑ کی کھوہ اختیار کرنی پڑی۔

سوچئے اور خوب سوچئے۔ آج علل و اسباب والے ایماندار اتنی ہمت دکھا سکتے ہیں۔ کہ دنیا کو چھوڑ ایک زاویہ خاموشی میں جا کر تمام سامانِ عیش و زندگی کو خیر باد کہہ سکیں۔ اور ہاتھ دھو بیٹھیں۔

جوشِ ایمانی | اپنی توحید کا اعلان ایسے ماحول میں۔ جس میں ایک بھی موجد نہ تھا۔ اور حکومت و اقتدار مشرکانہ ہو کچھ تھوڑی ہمت کا کام نہ تھا۔ لیکن جب کسی یقین کو پختگی نصیب ہوتی ہے۔ تو صاحبِ یقین و ایمان اپنے جذبہ یقین اور محبت میں اتنا سرشار ہو جاتا ہے۔ کہ اپنی زندگی و معیشت سے بے پروا ہو کر وہ کچھ کہہ دیتا ہے۔ جو ایک پوری قوم نہیں کہہ سکتی۔ چنانچہ اس جھوٹی طسی ایماندار ٹولی نے اپنا توحیدی اعلان اور ساتھ ہی غیر اللہ، الہوں سے بیزاری علی الاعلان کر دی۔ تو اس پر ہی بس نہ کی۔ بلکہ کھلے الفاظ میں ان کے مشرکانہ

عقیدہ کی تزیل کی۔ اور ہولاء قومنا اتخذوا من دونه الہتہ
 لولا یاتون علیہم سلطین بین فمن اظلم ممن افتری
 علی اللہ کذباً (دیکھو) اس ہماری قوم نے اس کے سوا کئی خدا بکڑ رکھے
 ہیں۔ کیوں نہیں یہ کوئی کھلی دلیل پیش کرتے۔ اللہ پر جھوٹا باندھنے والے سے
 بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے؟۔

دیکھئے کتنی لٹکارتے قوم کے عقیدے کی تزیل کرتے ہیں۔ کہ کوئی دلیل
 ہے۔ تو لائیے۔ پھر کس پیش سے آخری کلمہ کہا گیا۔ کہ اللہ پر جھوٹا باندھنے
 والے سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے۔

سبحان اللہ جب سچ دل میں سما جاتا ہے۔ اور حق کا حال پیدا ہو جاتا ہو
 تو پھر کسی کی مجال نہیں ہوتی۔ کہ کوئی مقابلہ کے لئے سامنے آئے۔ کتنی تزیل کرتے
 ہیں اور علی الاعلان کرتے ہیں۔ اور ساری قوم کو مخاطب کرتے ہیں۔ لیکن ہمت نہیں
 ہوتی۔ کہ ایک لفظ بھی سامنے آ کر کہے۔ یہ ہے حقیقی جوش ایمانی اور غیرتِ اسلامی
 کا نمونہ۔ اس اعلان اور احقاق حق کے بعد یہاں اپنی قوم میں رہنا مشکل ہو گیا۔ تو
 ٹولی کے کسی فرد نے مشورہ دے دیا۔

وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا
 يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهُ فَأَوْوَا
 إِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ
 مِنْ رَحْمَتِهِ وَيَهَيِّئْ لَكُمْ مِنْ
 أَمْرِهِمْ مَخْرَجًا

اور جب تم اور اللہ کے سوا جن کو وہ
 پوجتے تھے الگ ہو گئے۔ تو اب اس
 کھوہ میں جا کر ٹھیرو۔ اللہ اپنی رحمت
 تم پر بکھیرے گا۔ اور تمہارے کام کو
 با آرام بنا دے گا۔

کیا خوب مشورہ پیش کیا حلورکس ولیری سے دنیا کو چھوڑنے کی پیشکش کی۔ اور پھر کتنو پاک بھروسہ پر یہ کہ رب کریم اپنی رحمتوں سے ہمیں ڈھانپ لے گا اور ہمارا حصہ زندگی آخرت جس کے لیے ہم نکل آئے ہیں۔ ٹھیک اور درست فرما دے گا۔ اور ہم ایک پاک با آرام زندگی پسند کریں گے۔

یقین ہے یقین پیدا کرے ناواں یقین سے ہاتھ آتی ہے وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فتنوری

ایمان کیا ہے؟۔ مولاٹے کریم اور اس کی حکمتوں پر یقین۔ جب یہ یقین حاصل ہو جاتا ہے۔ اور نیک ظن کسی کا مولاٹے کریم سے ہو جاتا ہے۔ تو مشکلیں خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔ اَنَا عَسَدٌ ظَنِّ عَبْدِیْ بِنِیْ كِی واضح مثال ایک نہیں سینکڑوں دیکھی ہیں۔ جب کسی اللہ کے بندے نے اللہ پر بھروسہ کیا۔ اور اُسے کارساز حقیقی خیال کیا۔ تو پھر اُسے کسی دوسرے کے سہارے اور کارساز مجازی کی ضرورت نہیں رہی۔ اور وہ سامان پیدا ہو گئے جو عقل اور فہم اور خیال تک نہ آئے تھے۔ اس قصہ میں بھی یقین ہی یقین تمام مشکلات ظاہر و باطن کا حل آپ دیکھیں گے۔

غور! سوچنا یہ ہے۔ کہ یہ ٹولی فقرا کی ہے۔ یا طلبائے مدرسہ کی؟۔ مدرسہ کو جاننے نہیں یا کسی تانقاہ کا راستہ بونٹے؟ چلنا چاہتے ہیں یا وہ اپنے پائلے بے سرو سامانی کا سامان رکھتے ہیں یا سامانوں سے بھرے ٹرولر لے جانا چاہتے ہیں؟۔ اور پھر کس مقصد کے لئے سفر ہے؟ کوئی تجمالی خیال ہے یا صرف بونٹے کریم کی محبت سے سرشار ہو کر اللہ کے دیکھنے کی تمنا میں ہو گیا ہے؟

کے تعلقات کو ختم کر رہے ہیں۔ یا تعلقات کے جوڑ کے لئے یہ خلوت اختیار کر رہے ہیں۔ بے شک دنیا میں دنیا کے سوا جینا مشکل ہے لیکن یہ لوگ عام قماش کے آدمی ہیں۔ جن کا نظریہ ہے کہ دنیا کے سوا زندگی مشکل ہے۔ یا اس نظریہ زندگی سے بلند ہو کر پیٹ کی زندگی چھوڑ کر کسی اور زندگی کی تلاش میں ہیں۔ جس کے اندر کرپیٹ کی نہیں۔ صرف ایک محبت ہی محبت ہے۔ اور عقل و فکر سے بڑھ کر روحانی مشاہدات کی دنیا ہے۔ جس کے اندر سراسر یقین ہی یقین ہوتا ہے۔ زندگی بھی یقین اور موت بھی یقین۔ شک کو گنجائش نہیں رہتی۔ وہی شک جس کے بغیر ہم تم ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتے۔ نیک و بد بھی شک کی زد میں چلتا ہے۔ آج آخرت کی زندگی۔ سراسر شک ہو کر رہ گئی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ آخرت کی فکر معیشتِ دنیا نے اٹھا ہی دی۔ ورنہ کسے موت کا یقین نہیں؟ ہر زندہ کو اپنی موت سامنے ہے۔ پھر کیا وجہ ہے؟ کہ اس یقین کے اندر بھی شک پیدا ہو گیا۔ اور انسانی فکر کسی کام کا نہیں رہا۔ ”دھونی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا“ کے مصداق ہو بیٹھا۔

قصہ کی غرض و غایت

اس قصہ اصحابِ کف کو بھی اس غرض سے پیش کیا گیا۔ تاکہ صاحبِ عقل و ہوش آخرت کی زندگی کا سبق حاصل کریں۔ اور یہ دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ کیسے زندہ رکھتا ہے۔ جبکہ سامانِ خورد و نوش مہیا بھی نہ ہو۔ اور کیسے ان کی زندگی سے سبق دلانا ہے۔ اور وقت کے لوگوں کو جھنجھوڑتا ہے۔ کہ تم کیوں غفلت میں گذر رہے ہو۔ آخر کچھ موت کا فکر بھی چاہئے۔

غلام خنیال | بعض عام سطح کے لوگ نہیں۔ اچھے خواص صاحب علم بھی اعتراض اور شک پیدا کرتے ہیں۔ کہ ساری دنیا اگر اس آخرت کی زندگی کے لئے سب کچھ چھوڑ بیٹھے۔ تو دنیا کا کیا بنے گا۔ یہ ایک ایسا مغالطہ ہے جو شیطان الرحیم کے بڑے دھوکوں سے ہے۔ کوئی کام ساری دنیا جب نہیں کرتی اور نہ کر سکتی ہے۔ تو پھر کیسے خیال کر لیا جاتا ہے۔ کہ ساری دنیا آخرت کے لئے دنیاوی زندگی چھوڑ بیٹھے گی۔ بلکہ ہر ایک کی فطرت اپنی فطرت کے مطابق اپنے کام کاج کو پڑتی ہے۔ نہ تو ساری دنیا عالم ہو سکتی ہے۔ اور نہ جاہل رہ سکتی ہے۔ اسی طرح مثالی آدمیوں کی کمی تو اتنی ہے۔ کہ ایک آدمی بھی سینکڑوں میں ہو جاوے تو غنیمت۔ علم میں بیکتائی بھی اتنی ہی مشکل ہے۔ جتنی فقر کی بیکتائی مشکل ہوتی ہے۔ تاہم کچھ نہ کچھ علم ہونا ضروری ہے۔ تاکہ اس بیکتائی علم کی روشنی سے روشنی حاصل کی جاسکے۔ اسی طرح فقر کی بیکتائی سے بھی اسی وقت فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ جب فقر سے مناسبت کچھ پیدا ہو۔ اور یہی سنت اللہ جاری ہے۔ بعض لوگوں کو آخرت کے لئے چن لیا جاتا ہے۔ اور وہ تن دھن کو چھوڑ کر صرف اُس راہ میں چل نکلتے ہیں۔ تاکہ اُس دولتِ عظمیٰ سے مسرور ہوتے ہیں۔ جس سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں۔ یعنی معرفتِ الہیہ کے سرادقات تک جا پہنچتے ہیں۔ اور پھر اُن سے خواص و عوام کو فیض الہی پہنچتا ہے۔ جیسے دنیا میں ایک دنیا دار کمال تک دنیا کو پہنچاتا ہے۔ اور اس کی کھائی سے دنیا فائدہ اٹھاتی ہے۔ نہ تو ساری دنیا دولت مند ہو سکتی ہے۔ اور نہ فقیر۔ بعینہ یہی خیال اہل فقر کا ہے۔ وہ ساری دنیا کو فقر کے لئے تیار کرنے پر دنیا

سے بے تعلق نہیں کرتے۔ بلکہ چند نفوس جن کی فطرتاً نسبت دنیا بیزاری کی ہوتی ہے۔ انہیں تربیت دی جاتی ہے۔ اور باقی دنیا سے دنیاوی تعلق کو چھوڑنے کے لئے اتنا کہا جاتا ہے کہ

حلال و حرام کی تمیز رکھیں۔ اور غفلت سے بچیں۔ عبادت اور اوامر و منہیات پر مضبوطی جم جائیں۔ باقی ان کو اوامر کے ترک کرنے اور مجاہدات شاقہ پر غامدی ہونے کے لئے نہیں کہا جاتا۔ یہاں و دولت اور اولاد سے منتظر نہیں کیا جاتا۔ لیکن چوٹی کے آدمی جنہیں انسانی دنیا کا مرشد بنا ہوتا ہے۔ انہیں اس بند دنیا سے خلاصی دلانی جاتی ہے۔ اور ان کو دنیا سے اٹھا کر عرش مجید پر بٹھانے کے لئے وہی سبق ”دنیا بیزاری“ دیا جاتا ہے۔ تاکہ دنیاوی تعلق سے الگ ہو کر صرف اس ذاتِ حق سبحانہ کے ہو کر دنیا کی رہنمائی کا فریضہ ادا کریں۔ اور شاہ و گدا۔ جاہل و عالم ان سے سبق لے۔ اور دنیا و آخرت کے لئے رہنمائی حاصل کریں۔ غرض اس مقام بلند کے حاصل کرنے کے لئے دنیاوی تعلقات زہرِ قاتل ہیں۔ اور جب تک ان تعلقات کو ختم نہ کرایا جاویگا۔ مولے کریم کی جھولی میں بیٹھنا نصیب نہیں ہو سکتا۔ یہ قصہ بالکل اسی مثالی توضیح کے لئے مولے کریم نے قرآن حکیم کے ذریعہ آیاتِ محکمات کے حکم میں بطور ہدایت مرحمت فرمایا۔ اب ہمارا فرض ہے۔ کہ اس کے تمام انوار اور اسرار سے فائدہ اٹھائیں۔ اور ایک ایک لفظ سے ہدایت حاصل کریں۔ اور شک و شبہ کو گنجائش نہ دیں۔

یاد رکھئے۔ نسلوں کے یہ صحیح ہے سہ

یاد او سرایۂ ایماں بود

ہر گدا از یاد او سلطان بود

ایک نہیں لاکھوں کو اس کی یاد پر شاہی نصیب ہوئی۔ یہی بلا بل حشمتی کیا تھے؟ اور سر ہندی کیا تھے؟ ان کو درویشی سے پہلے کون جانتا تھا۔

تیری دوستی سے پہلے مجھے کون جانتا تھا

ترے عشق نے بنایا مری زندگی فسانہ

ان کی درویشی کے سامنے بادشاہ جھک گئے۔ اور ان کے جوتے اکٹھانے فخر

خیال کرتے گذرے۔ یہ تو ایک دو مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ لیکن اس زمین پر نہیں

لاکھوں بندگان خدا نے یہ رتبہ پایا۔ کہ دنیا غلام ہو کر رہ گئی۔ اور بادشاہوں سے

بڑھ کر ان کا وقار دنیا میں قائم ہو گیا۔ اور ان کے ارشاد کی تعمیل ایک دنیا نے کی۔

اور ہدایت پائی۔ اور فلاح سے ہمکنار ہوئے۔

یہی مثال اصحاب کہف کی دیکھ لیجئے۔ کہ ابتداء کس بے رحمی سے گھر کو

خیر یاد کہا۔ ساری دنیا ان کی دشمن تھی لیکن جب کھوہ (الکھف) کی زندگی کے بعد

باہر نکلے۔ تو ایک دنیا ان کی شہیدائی ہو گئی۔ شاہ وقت تک جھکا۔ اور ان کی اس

زندگی کھٹی سے اللہ تعالیٰ کو رحم آیا۔ اور ساری دنیا کو ایک دین کے لئے ہموار کر دیا۔

جو دین چہند آدمیوں کا تھا۔ اور جس کی وجہ سے انہیں شہر بدر ہونا پڑا تھا۔ یہ مولیٰ کریم

کی قدرت کاملہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اس ہجرت اور ترک وطن پر جو سراسر

مخلصانہ اور صرف ذاتِ علیہ السلام کے لئے تھا جسم کھایا۔

یاد رکھیے۔ اور ہمیشہ یاد رکھیے۔ کہ اخلاص کی ابتدا ابتلا ہوتی ہے۔ اور اخلاص کو دیکھنے کے لئے ایسے پتال جنتر سے کھینچا جاتا ہے۔ جس کا خیال نہیں ہوتا لیکن جب امتحان الہی سے کوئی اللہ تعالیٰ کا بندہ نکل جاتا ہے۔ اور اس آزمائش سے کامیابی ہو جاتی ہے۔ تو مولیٰ کریم اس اپنے بندے کے ہورہتے ہیں۔ اور پھر جو وہ چاہتا ہے۔ ہو جاتا ہے۔ یعنی ایک طرف کوئی خیال آیا۔ دوسری طرف وہ خیال پورا ہو گیا۔ سالک کو خود پتہ چل جاتا ہے۔ کہ کُن سے کیسے دُنیا پیدا ہوئی۔ ایک ارادہ اور صرف ایک کلمہ کُن سے دُنیا پیدا ہو گئی اور ہوتی جا رہی ہے۔ اس آیت کے بعد اب صورت الکھف دکھائی جاتی ہے۔ کہ وہ کیسی تھی :-

الکھف کا نقشہ

تو رے مخاطب دیکھے۔ کہ سورج	وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ
جب چڑھتا ہے۔ تو اس کھوہ کے	تَزَاوَرَعَنْ كَهْفِهِمْ
دائیں طرف سے نکل جاتا ہے۔ اور	ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَتْ
جب ڈوبتا ہے۔ تو ان کے بائیں	تَقْرِيضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ
سے کترا جاتا ہے۔ اور وہ ایک کھلے قعر	وَهُرِّي فَجَوْثٍ مِّنْهُ ط
پر اس میں ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرتیں	ذَلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ ط مَنْ
ہیں اور نشانات جس کو اللہ تعالیٰ راہ	يَهْدِي اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ط

لَهُ وَلِنَبَلُوْنَاكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجَمْعِ لَمْ

وَمَنْ يُضِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ
وَلِيًّا مَرشِدًا ۝

دکھائے وہی راہ درست پر ہوتا ہے۔
اور جسے بھلا اور ہسکا دے۔ تو پھر اس کا

کوئی رفیق راہ ہدایت پر لانے والا نہیں۔

آیت آپ کے سامنے ہے۔ اپنے اپنے خیال میں اس کی صورت بنائی گئی۔
میرے خیال میں اس کا ایک سر شمال مغرب۔ اور دوسرا سر جنوب مشرق کی طرف
تھا۔ اور کئی میل لمبی تھی۔ جس کے میان میں کچھ چوڑائی کی جگہ ایسی تھی۔ جس پر چھت سیا
کچھ تھا۔ یعنی پہاڑ کا الٹا ہوا حصہ تھا۔ جس کے نیچے وہ آرام سے رہتے تھے۔ اور نہ
دھوپ کی تکلیف تھی۔ کیونکہ صبح سویرے دھوپ کو پہاڑ کی دیوار وائیں طرف سے
بچاتی تھی۔ اور ویسے ہی شام کو دوسری جانب کی دیوار کھوہ ان کو بچاتی تھی۔ پھر دوپہر
کو وہ ”فجہ“ یعنی جو چوڑائی درمیان میں دونوں دیواروں کے پیدا تھی۔ انہیں آرام
دیتی تھی۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ محل وقوع بھی الکھف کا گرم علاقہ میں تھا۔ جہاں سردی
یا تو ہوتی نہ تھی۔ یا بہت کم۔ جس کے بچاؤ کے لئے کسی اسباب کی ضرورت نہیں
تھی۔ اور گرمی زیادہ اس علاقہ میں تھی۔ لیکن الکھف کا وقوع ایسے تھا۔ کہ خود بخود
دھوپ سے بچاؤ ہو جاتا تھا۔

مولانا آزاد (مرحوم) نے اپنے تفسیری نوٹ میں لکھا ہے۔ الرقیم۔ بمعنی مرقوم
رختی نہیں۔ بلکہ الرقیم وہی شہر ہے جس کا ذکر تورات میں راقیم کے نام سے آیا ہے۔
اور جزیرہ نمائے سینا اور خلیج عقبہ کے سیدھے شمال کی طرف دو پہاڑی سلسلہ کی
سطح مرتفع پر واقع تھا۔ جسے مغربی پہاڑ اور عربی بصرہ کہتے ہیں۔ وہاں واقع تھا۔ ہیں

نے یہ نوٹ اس لئے دکھایا۔ کہ یہ معلوم ہو جائے۔ کہ وہ گرم تھا۔ نہ کہ سرد۔ کیونکہ سردی کے بچاؤ کی ضرورت واقع ہوتی۔ ویسے مذہب عیسوی کی مرکزیت کے قریب بھی تھا۔ اور مناسب بھی ہی معلوم ہوتا ہے لیکن یہ خیال بھی آتا ہے۔ کہ الکھف کے ساتھ جب الرقیم کو جوڑ دیا گیا۔ پھر لامحالہ تختی نقوش یا مھرہ اختیار کرنا زیادہ اولیٰ ہے۔ بہر صورت یہ کہف و کھوہ ان کے گھر کے بہت قریب نہ تھا۔ کیونکہ جملہ **فَاَوْرَاۤیَ الْكَهْفِ** مان معلوم ہوگی۔ لیکن آبادی سے دُور اور آبادی سے خالی۔ کیونکہ اس زمانے کھلی زمین بھی بہت کم آباد تھی۔ ایسے حال میں کھوہ کی آبادی کا خیال تک نہیں ہوتا۔ درخت بھی غالباً نہ ہوں گے۔ ورنہ ان کے سایہ کی طرف اشارہ ہوتا لیکن باہمت مروان خدا کے لئے وہ جنتِ ارضی ہو گیا تھا۔ اب اس کے بعد اس حال کو بیان کیا جاتا ہے۔ جو اس کھوہ کے اندر ان پر وارد ہو گیا۔ اور ان کی صورت و سیرت میں نمایاں تبدیلی کا باعث ہوا۔

وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَانًا وَّهُمْ
 رُقُودٌ وَّنُقَلِبُهُمْ ذَاتِ
 الْيَمِينِ وَذَاتِ الشِّمَالِ ط
 وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ
 بِالْوَصِيدِ لَوِ اطَّلَعَتْ
 عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتْ مِنْهُمْ
 فِرَارًا وَّلَمَلْتُ مِنْهُمْ
 رُعْبًا

تو جانے وہ جاگتے ہیں لیکن وہ سوتے
 ہیں اور ان کی کروٹیں دائیں بائیں ہم
 بدلتے ہیں۔ اور ان کا کتا چوکھٹ
 پر ہاتھ پھیلائے ہے (اے مخاطب)
 اگر تو ان کو جھانک دیکھے تو
 پیٹھ دے کر بھاگے اور پھر
 جاوے اس کی وحشت تجھ میں۔

آپ ترجمہ دیکھ لیں لیکن تمام قصہ کی جان ہی ہے۔ اور اس آیت پر مختلف خیالوں نے نئے نئے کر کے قصہ کی حقیقت کو ایک دوسرے سے بہت دور جا پھینکا۔ اور کسی ایک حقیقت پر اتفاق نہیں ہوا۔

اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُعْبَدُوْنَ پہلے دھوکا ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے اور تقدیم تاثر سے کہیں سے کہیں دور نکل گئے ہیں۔ عام خیال یہی ہے کہ وہ سوتے ہیں لیکن ان کی آنکھیں کھلی ہونے کی وجہ سے جاگتے نظر آتے ہیں لیکن پچھلے مفسرین یہ نہیں مانتے۔ کہ آنکھیں کھلی ہونے پر ایک مردہ کو زندہ خیال کیا جاوے۔ لیکن باوجود اس طرف ان کا ذہن جانے کے اصل مطلب ان پر نہیں کھل سکا۔ پھر اسی لکیر پر چل دیئے۔

عاجز کا خیال یہ ہے اور انشاء اللہ درست بھی ہوگا۔ مخاطب کو کہا جاتا ہے۔ کہ تو ان کو جاگتا خیال کرتا ہے لیکن حقیقت میں وہ سوئے ہوئے ہیں۔ یہ جاگتا تو اس وقت خیال میں آتا ہے۔ جب وہ چلتے پھرتے نظر آتے ہوں۔ یا کوئی ایسا کام کر رہے ہوں جن سے جاگنا معلوم ہو۔ بلکہ جاگتے ہیں تو کچھ شک نہیں رہا جب دیکھنے والا ان کو جاگتا خیال کرنے لیکن دوسری بات ایسی ہے جس کو خود اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے ”وَهُمْ رُقُودٌ“ حالانکہ وہ سوتے ہیں۔ بیان فرماتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ یہ کیا حال ہے۔ ایک طرف جاگنا اور دوسری طرف ان کا سونا تصور کرنا درست ہو۔

اصل میں موتے کریم نے ان کی وہ حالت بتلائی ہے۔ جو ایک اللہ اللہ کرنے والے کو ہو جاتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کے دھیان میں سب کچھ مجبول جاتا ہے

اور محبت کی غنودگی چھا جاتی ہے۔ دیکھنے والا سا لک کو دیکھتا ہے۔ کہ وہ مشغول ہے۔
 ہے۔ لیکن اُس کا اندرونی حال ایسا ہوتا ہے۔ کہ باوجود مشغول کے وہ ایک سوئے
 ہوئے کی طرح جذبات زندگی سے پاک ہوتا ہے۔ جس میں یکسوئی کے مراحل اپنے
 حال سے اسے ایسا کر دیتے ہیں کہ وہ خود اپنی ذات کا احساس تک نہیں رکھتا۔ چہ جائیکہ
 دوسری دنیا کی طرف اُس کی آنکھ ہو۔ یا کچھ اُسے احساس ہو۔ وہ سراسر محبت میں غرق،
 مدہوش ہوتا ہے۔ مولیٰ کریم نے ان الفاظ میں اس حال کی تعبیر کو بیان فرمایا۔ لیکن عام
 دنیا چونکہ اس حال سے ناواقف ہے۔ اس لئے اس حال کی تعبیر پر طرح طرح کے
 خیالات من گھڑت اکھٹے چلے گئے۔ اور کیا عجب اُس وقت کے لئے وہی کچھ مفید
 ہو۔ لیکن آج جب علوم انتہا تک پہنچ گئے۔ ماہرین نفسیات نفسی حالات کا خبر
 ہو گئے۔ تو اب ان الفاظ کے معانی اور ان کی حقیقت سمجھنے میں کچھ مشکلات نہیں بلکہ
 سیدھی سادھی بات ہے۔ جو کسی کے عقل میں نہیں سمائی۔

وَنُقَدِّبُهُنَّ ذَاتَ الْيَمِينِ
 وَذَاتَ الشِّمَالِ
 ہم دونوں بائیں اُن کو بلا (پھیرتے)
 دیتے ہیں۔

چونکہ اصحاب کف کو پہلے جملے سے یہ تصور کہ لیا گیا تھا۔ کہ وہ سوئے ہوئے
 ہیں (ذہن ساقوڈ) تو پھر اس جملے کے سیدھے سادے معنی کو اٹھانے کی
 ضرورت محسوس ہوئی۔ اور یہ مطلب نکالا گیا۔ کہ ان سوئے ہوئے کے پہلو و اہن بائیں
 اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے بدلو اتے رہتے ہیں۔ تاکہ ان کے پہلو زمین پر لگنے سے
 سڑ نہ جائیں۔ حالانکہ اس تاویل کی بعد میں ضرورت نہ تھی۔ اگر پہلے جملے کے معنی
 صحیح کر لئے جاتے۔ سیدھے سادے معنی یہ ہیں۔ کہ ہم اُن کو اِدھر و اُیں طرف

اور ادھر بائیں طرف پھیرنے لگتے رہتے ہیں۔ عام محاورہ کلام حکیم میں آتا ہے۔ کہ انسانی
افعال پر گاہ گاہ جہاز می پروہ کو چھوڑتے ہوئے حقیقی راز کو افشا کر دیتے ہیں کہ ہم
ایسا کرتے ہیں۔ چنانچہ بعینہ یہاں ہی حال ہے۔ جب ان کے جذبات اندرونی
کو محبتِ خاصہ نے کھا لیا۔ اور کوئی جذبہ اور خواہش نہ رہی۔ تو اب ان کی حرکت
حرکتِ الہی کے ماتحت ہو گئی۔ الکھف کے اندر ادھر ادھر پھرنے کو اپنی طرف منسوب
کیا۔ ورنہ سونے کے ساتھ دور کا واسطہ بھی نہیں۔ سوتے بھی ایسے ہوں گے۔
جیسے جاگتے۔ یعنی سونا بھی ان کا منسوب الی اللہ ہو گا۔ یا آرام سے بیٹھنا بھی۔ غرض
میری سمجھ میں تو یہ آتا ہی نہیں۔ کہ اَيْقَاطًا کے ساتھ مَرْقُودًا لگانے سے نسیبند
وائی ان پر چھائی ہوئی تصور کی جائے۔ پس ایک حال ہے جس کو مولیٰ کریم نے بیان
فرمایا۔ پھر اس حال کے مطابق ان کے چلنے پھرنے کو اپنی طرف منسوب کیا۔ کیونکہ
ان کے اندر کوئی ارادہ نہ رہا تھا۔ محبت تھی اور صرف محبت اور پس۔

كَذَّبُوهُ بِأَسِطٍ ذَرَّاعِيهِ
بِالْوَصِيدِ ط

جب کوئی کسی کا ہو جاتا، تو دروازے
کاگتا۔ چوکھٹ کاگتا محاورہ استعمال
ہوتا۔ یہ بھی ایک محاورہ ہے۔ جب کتا کسی کے در کا ہورہتا ہے۔ تو ادھر ادھر سے
گھوم کر چوکھٹ پر آکر بیٹھ جاتا ہے۔ اور اندر نہیں گھستا۔ نچتہ خیال ہی ہے۔ گتتا
حسب معمول ان کے آنا جانا ہوگا۔ اور جب وہ۔ فجورہ۔ والان پر پہنچتے ہوں گے۔ تو
فجورہ کی چوکھٹ سے ہاتھ پھیلائے بیٹھ جاتا ہوگا۔ چونکہ ایک طویل عرصہ ایسا ہوتا رہا۔
تو ایسے الفاظ سے کیا تعبیر فرمائی گئی! کہ وہ ہمیشہ ایسا ہی ہاتھ پھیلائے چوکھٹ
پر بیٹھا تھا۔

لَوِاطَلَعْتَ عَلَيْهِمْ

اب یہ تمیسرا جملہ بیان کرتا ہے۔ کہ اے

لَوَكَيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا۔

مخاطب اگر تو ان کو جھانک کر دیکھے تو

بچھلے پاؤں ان سے بھاگ نکلے۔ بے شک مردوں کو دیکھنے سے خوف آتا ہے۔

لیکن دوسرا جملہ اس خوف کو رعب کے ساتھ بدل دیتا ہے۔

وَلَمَلَعْتَ مِنْهُمْ رُعبًا

یہ تو زندوں سے اور ان زندوں سے

جن کی شکل و شباهت بھی پر شوکت ہو۔ اکیلے زندہ سے بھی رعب اٹھنا مشکل ہوتا

ہے۔ یہ رعب و شوکت حال محبت و عشق الہیہ سے اٹھتا ہے۔

ہمیتِ حق است آں از خلق نیست

ہمیتِ آل مرد صاحبِ دل نیست

ہر کہ تر سید از حق و تقوئے گزید

ترسد از رے جن و انس و ہر کہ دید

خطیب کلام کا خطاب بظاہر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف معلوم ہوتا ہے

کہ حقیقی مخاطب اللہ تعالیٰ کے وہی ہو سکتے ہیں لیکن حقیقتاً ہر وہ شخص مخاطب ہے

جو یہ کلام معجز سنتا ہے۔ یا پڑھتا ہے۔ عام اسلوب قرآن حکیم ایسے ہی ہے۔

الْمُرْتَدِّ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ

الْفِيلِ ۝

تَرَاهُمْ رُكْعًا يَنْجَلًا ۝

وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الْمُجْرِمُونَ ۝

الْأَيْتَةُ ۝

الْأَيْتَةُ ۝

الْأَيْتَةُ ۝

الْأَيْتَةُ ۝

الْأَيْتَةُ ۝

الْأَيْتَةُ ۝

الْأَيْتَةُ ۝

اس خطاب کا مخاطب ہے۔

سب اصحابِ کہف

کہتے ہیں یہ کتا ایک گڈریا راجپڑی کا تھا جو ریوڑ چراتا تھا۔ جب اصحابِ کہف کا ٹولہ اس کے پاس سے گذرا تو اس نے صورتِ حال دریافت کی۔ چونکہ وہ اللہ والے تھے۔ اور ان کے چہرے حال کی حلاوت سے بھرے تھے۔ اسے بھی ان کی ہمراہی کا شوق ہو گیا۔ اور ریوڑ چھوڑتا ساتھ ہو گیا۔ کتے کو ہر چند دھتکارا لیکن اُسے اللہ تعالیٰ نے زبان دی اور اس نے کہا۔ تم جاتے ہو۔ تو میں اس پاک گروہ کے ہمراہ کیوں نہ جاؤں؟

اس کے علاوہ میری ذاتی رائے تو یہ ہے۔ کہ جو کچھ اس نے کہا زبانِ حال سے اور اپنی آنکھوں سے کہا۔ جب محبت والے کی آنکھیں دوچار ہو جاتی ہیں۔ تو آنکھیں وہ کچھ محبت کے اسرار ایک دوسرے تک پہنچاتی ہیں۔ جو زبان پر نہیں آسکتے اور نہ ہی زبان و دل کو ان کے بیان کرنے کی توفیق اور طاقت ہوتی ہے۔ گڈیے نے جب دھتکار کر دیکھا ہوگا۔ تو کتے کی آنکھوں نے اپنی محبت بھرا دل پیش کر دیا۔ پھر کس کی ہمت ہو سکتی ہے کہ محبت بھری آنکھ کے مقابلے میں اسے دھتکارے اور اپنے سے ہٹائے۔

فیضانِ نظر

فیضانِ نظر سے کسے انکار ہے۔ اقبال مرحوم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی

حقیقی نظر کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندئ؟

لیکن فیضانِ نظر کا درجہ یہاں ایک اور بڑھ گیا ہے۔ وہ باپ تھے یہ بیٹے لیکن
یہاں ایک جانور اور جانور بھی وہ جسے دنیا بخش اور پلید خیال کرتی ہے لیکن فیضانِ
نظر نے اُسے کہاں پہنچایا۔ قرآن حکیم شاہد ہے۔ حدیث فرماتی ہے۔ کہ یہ جنت
میں ان کے ہمراہ جائے گا۔ جن کے در دولت کا وہ ہو رہے ہے سعدی فرماتے ہیں
سگِ اصحابِ کف روزے چند پٹے نیکاں گرفتِ مردم شد
پسِ رُوحِ با بدارِ بنشست خاندانِ نبوتش گم شد

محبت

محبت بڑا اثر رکھتی ہے۔ اور جیسی محبت ہوتی ہے۔ ایسے ہی اثرات پیدا
ہوتے ہیں۔ سلوک الی اللہ میں کیوں محبت پر مقدم رکھی ہے۔ اور کیوں ربی کے ساتھ رہنے
کو ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ صرف اس لئے کہ محبت سے فیضِ نظر کے علاوہ جو انوار
قلبی کو مرید پھینکتی رہتی ہے۔ ایک طرح سے رفاقت اور مصاحبت اور خدمتگذاری
سے انس پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس انس کی وجہ سے انوارِ ربی طالب کے دل کو
کھا جاتے ہیں۔ اور دوئی کا شائبہ تک اٹھا دیتے ہیں۔ اور پیر و مرید میں دوئی کی
گنجائش نہیں رہتی۔ اس وقت وہ حدیث سامنے آجاتی ہے۔ کہ جو کچھ میرے سینے
میں ڈالا گیا ہے میں نے وہ ابو بکر کے پیچھے میں ڈال دیا۔

وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ
بِالْوَصِيدِ

اُن کا کتا بازو پھیلائے چوکھٹ پر ہے۔ کتتی بڑی حقیقت کی طرف اشارہ

ہے۔ کہ وہ کتا اُن کا ہو رہا تھا۔ اور محبت کے مارے ہر وقت اُن کے دربارِ عالیہ کی چوکھٹ پر سر رکھے ہوئے تھا۔ کتے کی عام عادت ہے جب کسی سے اُسے پیار ہو جاتا ہے۔ تو ایسی صورت میں اس کے سامنے بیٹھ کر آنکھ کو اپنے مربی کے قدموں پر رکھے رکھتا ہے۔ اور نظر کو ایک لمحہ بھی ادھر ادھر نہیں پھیرتا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ حکم کا منتظر ہے۔ اور یا محبت کی وجہ سے آنکھ لڑائے ہوئے دم ہلاتا ہے جس سے اس کی محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ اصل میں یہ حال اس غرض سے پیش کیا گیا۔ لیکن اہل علم دوسری طرف متوجہ ہو گئے۔ اور اسے پاسبان کی خدمت میں دکھایا۔ بھلا ایسے جنگل میں ایک کتا صرف بھونکنے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔ اور سیر ذاتی تو یہ خیال ہے۔ کہ جس دن سے وہ اُن کے ہمراہ ہوا ہوگا۔ بھونکنا بند ہو گیا ہوگا۔ اور سر ڈالے اُن کے ہمراہ ہوگا۔ اور جہاں وہ جاتے ہوں گے۔ وہاں ان کی دلہیز پر سر ڈالے نظر آتا ہوگا۔ کیا عرض کروں۔ منکر ہمیں بقدر ہمت اوست۔ اصحابِ کھف کا تو خود مولے کریم نگہبان تھا۔ کتے بیچارے کی کیا طاقت اور اگر دونوں باتوں کو تسلیم کر لیا جاوے۔ تو کیا حصرِ خدمت گزار عاشق اپنی محبت کے ساتھ ان کی خدمت سے بھی خالی نہیں رہتے۔ یہ بھی تھا۔ اور وہ بھی تھا۔ بہر صورت عام خیال میں کوئی اپنی عجیب بات نہیں جس کی وجہ سے اسے ذکر کیا جاوے۔ البتہ یہ محبت ہی ایک ایسی دولت ہے۔ جس کے لئے ذکر ہوتے ہیں۔ خود اصحابِ کھف کا قصہ ایسی محبت

کی نشان دہی کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔ آج یہ قہر اور کیوں اصحاب کھف
ابھی تک زندہ ہیں۔ صرف محبت الہیہ کی وجہ سے۔
ہرگز نیرد آنکہ دشمن زندہ شد بعشق
ثبت است بر حبریدہ عالم دوام ما

ایک مہم

کسی کا یہ خیال ہو۔ کہ متقدمین نے تو اصحاب کھف کو سوتے بتایا۔ اور نیند
طاری ہو جانے سے کھانے پینے کی ان کو ضرورت نہ ہوئی۔ اب بیداری میں
لوازمات بیداری سے کھانے پینے کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اتنی
مدت کیسے بن کھائے بن پئے گزار سکتے تھے۔

لیکن سوچا نہیں گیا۔ صرف نیند اگر طاری ہو۔ تو بھوک زیادہ لگتی ہے۔
کیونکہ اس صورت میں مضم بیداری سے زیادہ ہوتا ہے۔ اور جب بھوک تیز ہو
جاتی ہے۔ تو نیند خود بخود اچاٹ ہو جاتی ہے۔ نیند بھی ایسی صورت میں ہمارے
خیال کے لئے موزید ہو سکتی ہے۔ جب نیند کے ساتھ اور حالت بھی ایسی طاری
ہو۔ جو بھوک کو بند کر دے۔ تو ہم یہ کہہ دیتے کہ وہی حالت بیداری میں جب طاری
ہو جاوے۔ تو کیوں نہ بھوک بند ہو۔

ویسے کوئی قرینہ قرآن حکیم میں موجود نہیں۔ کہ انہوں نے اس مدت میں کچھ نہ
کھایا ہو۔ بلکہ بعض الفاظ سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ شاید نیند میں رہے جو موت
کے برابر خواہشات کے ختم ہونے کی وجہ سے تھی۔ لیکن یہ خواہشات بیداری میں بھی

ختم ہو سکتے ہیں۔ اور صرف ایک لفظ "بَعَثْنَا هُوَ" ایسا ہے جس کے لئے تمام آیات کے معانی کو الٹنا پڑا۔ اور ایک بہت خیالی تصویر مردوں کی سی بنائی پڑی۔ میرے نزدیک تو حال ہی اتنا بلند ہو گیا تھا کہ بَعَثْنَا هُوَ کے لفظ سے اس حال کے نزول کے وقت فرمایا گیا۔ ہر صاحبِ حال۔ بلکہ ہر محب پر ایک عالی قلبہ محبت میں ایسا وارد ہوتا ہے۔ کہ تن من کی خبر نہیں رہتی۔ اور تمام خواہشات مٹ جاتی ہیں۔ لیکن جب محبت پختہ ہو جاتی ہے۔ اور عروج سے نزول کی طرف روح محبت قدم اٹھاتی ہے۔ تو پھر ہوش و حواس درست ہونے لگتے ہیں۔ اور تمام خواہشات عموماً آتی ہیں۔

اصحابِ کف کھاتے ہوں گے۔ لیکن دانہ غلہ نہیں۔ پھل پتے جو وہاں موجود ہوتے ہوں گے اس پر گذران ہوگی۔ ہر ملک میں اور ہر جگہ اور کھوہ میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے جلو سے برابر نظر آتے ہیں۔ کہ جانوروں کی زندگیاں بسر ہوتی رہتی ہیں۔ چائے کیا پیتے نہیں؟ لیکن کتنے آدمی ان پتوں کو جوش دے کر اب بھی اپنی حیات کا سامان روٹی کے بغیر پاتے ہیں۔ پھر اگر جنگلی مرغ اور پرندوں ہی کو خیال کر لیا جاوے۔ تو بنی اسرائیل کی ایک پوری قوم کی گذران من و سلوئی پر ہوتی رہی۔ تو کیا عجب۔ چند آدمیوں کی گذران ایسی ہی ہو جاوے۔ من و سلوئی کیا تھے۔ کچھ پرندوں کا گوشت اور کچھ درختوں پر پڑی ہوئی اوس۔ جو شیرینی کا کام دیتی تھی۔ بہر صورت ہمارے ذہن میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کی وجہ سے کوئی بات بھی اچنبھا (عجیب) معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ نیست سے جب ہست پیدا کرنے کا ہم یقین رکھتے ہیں۔ تو پھر ایسی معمولی اشیا کے موجود کرنے میں

ہمیں کیوں تاویلات میں جانا پڑے۔ بات صاف ہے۔ اور کسی قسم کی الجھن ہے
خیال (نظریہ) میں پیدا نہیں کی جاسکتی۔ آگے چلیے

وَكَذَلِكَ بَعَثْنَا هُمْ
لِيَتَسَاءَلُوا بَيْنَهُمْ قَالِ
قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ
قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ
يَوْمٍ قَالُوا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ
بِمَا لَبِثْتُمْ فَابْعَثُوا أَحَدَكُمْ
بِرِزْقِكُمْ هَذِهِ آيَةُ
الْمَدِينَةِ فليُنظَرِ أَيُّهَا
أَتَى طَعَامًا فليَأْتِكُمْ
بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلِيَتَلَطَّفَ
وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَدًا

اور اسی طرح ہم نے ان کو جگایا۔ کہ
لگے آپس میں پوچھنے۔ ان میں سے
ایک نے پوچھا۔ کتنی دیر تم ٹھہرے۔
تو دوسروں نے جواباً کہا۔ کہ ہم ایک
دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے۔ کچھ ان
میں سے بولے۔ جتنا ہم تم ٹھہریے
خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ تو ایک کو
ایک روپیہ دے کر گاؤں میں تو بھیجو۔
کہ اچھا ستھر لڈیکھا نا تمہارے
لئے لائے۔ اور زمی اور آہستگی سے
جائے اور کسی کو خبر نہ ہونے دے۔

اسی بَعَثْنَا کے معنی میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ بعثت سے۔ قیامت
کے اٹھنے کو تعبیر اکثر کیا گیا ہے۔ بعثت انبیاء کے الفاظ سے وہ قیاس یعنی
مراد نہیں لیا جاتا۔ بلکہ انبیاء کا تشریف لانا مراد لیا جاتا ہے۔ صاحب ترجمہ نے
بھی بعثت کے معنی جگا دینے کے کئے ہیں۔ یعنی ہوشیار ہو جانا۔ لیکن اگر اس
ہوشیاری کے معنی لے کر پہلے حال سے بیداری مراد لی جائے۔ تو کیا ادب پر
بات ہوگی! نہیں اوپر گز نہیں۔

اس بے شک کے ساتھ جب یہ کبشتا ہم دیکھتے ہیں یعنی ٹھہراؤ کتنا ہوا؟ تو اس کے جواب میں دیکھتے ہیں۔ یہ جواب ملتا ہے۔ کہ ایک دن یا اس کا کچھ حصہ۔ تو لامحالہ نیند کی طرف طبیعت چل ہی نکلتی ہے۔ ورنہ قرآنی قرینہ کوئی ایسا نہیں جس پر یہ فیصلہ کئی نیند کا دیا جاوے۔ بلکہ خود قرآنی فیصلہ ہے وَحَسَبُہُمْ اِنْفَاظًا کہ تو ان کو جاگتا خیال کرتا ہے۔ اور وَهَرُ قُوْدًا حَالًا کہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔ جیسے پہلے لکھا گیا۔ کہ ہم کسی طرح ظاہر کو نہیں چھوڑ سکتے۔ جبکہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ کہ وہ جاگتے ہیں۔ سونے کا علم اندرونی قرآن حکیم نے بتلایا۔ کہ کھوہ اندر وہ سوئے ہوئے تھے۔ بے شک اندر اندر سوئے ہوئے ہوں۔ لیکن ظاہر تو ہم انہیں جاگتا ہی کہیں گے۔ اور جاگنے کے حکم میں ان کو کہیں گے۔ رہا ان کا یہ کہنا کہ ہم دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے۔ یہ وہی نیند باطنی ہے جس کی بابت اللہ تعالیٰ نے ہمیں علم دیا۔ اگر وہ نہ دیتے۔ اور ہم انہیں جاگتے خیال کرتے۔ تو پھر ہمارے ذہن اس طرف کبھی نہ منتقل ہوتے لیکن آخری فیصلہ وہ بھی نہ دے سکے۔ کہہ دیا تمہارا اللہ ہی ہمارے ٹھہرنے کو بہتر جانتا ہے۔ اور اچھے طعام کو طلب کرنے کے لئے بعض مفسرین نے لکھا ہے۔ کہ ان کو چونکہ بھوک زیادہ نہ تھی۔ اس لئے اچھا اور سٹھرا کھانا طلب کیا۔ ورنہ بھوک میں یہ الفاظ نہ کہتے۔ لیکن سیکر نزدیک وہ کھاتے اور پیتے تھے لیکن جب پہلا حال گیا۔ تو روزانہ کا

کہ لبثتم فی الارض عدد سنین ہ قالو لبثنا یوما او بعض یوم فاسئل
العادیین ہ یہاں لبثتم کے معنی ٹھہرے یعنی زندہ رہے۔

کھانا سادہ ہونے کی وجہ سے اتنا مرغوب نہ تھا۔ بلکہ لذیذ کھانے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ جو کبھی وہ کھایا کرتے تھے۔ جب محبت میں ہوش آتا ہے۔ تو پھر قدم نیچے کرنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور حافظہ میں کھلی اشیا سامنے آ جاتی ہیں۔ چنانچہ اب کھانے یاد آئے۔ جو کبھی بازاروں میں کھاتے تھے۔

اس میں شک نہیں اس خیال کے ساتھ معاً یہ خیال پیدا ہو گیا۔ کہ وقت چونکہ کچھ زیادہ نہیں گذرا۔ وہی لوگ اب بھی شہروں میں ہوں گے۔ اور وہی بادشاہی جسے چھوڑ کر گئے ہیں ہوگی۔

مگر یہاں صدیوں کا تفاوت ہو چکا تھا۔ اور کئی انقلابات ہو چکے تھے۔ جو ان کے علم تک نہ آتے تھے۔ اور آتے کیسے۔ جب انہیں اپنے قیام کھف کا پتہ تک ہی نہیں۔ کہ کتنا ہم ٹھیرے۔

یہ بھی کوئی قدرت الہی کے اچھے کی بات نہیں۔ کہ ایک طرف سالوں اور قرون گذر جائیں۔ اور دوسری طرف ایک آن کا وقت گذرا ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کے راستہ کا مطالعہ فرماتے۔ ایک طرف تو دروازہ کی کٹڑی ہل رہی تھی۔ اور دوسری طرف آسمانی سیر کی لاکھوں مسافتوں کی سیر ہو چکی تھی۔ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کئی سالوں کی سیر کے برابر وقت کو شمار فرماتے تھے۔

غوث علی قلندر کے ایک قصہ میں بھی ایسا حال لکھا گیا ہے۔ گو تعجب ہوتا ہے۔ لیکن وہ خود اس وقت بیک وقت دو رخہ ہونے کے قائل ہیں۔ یعنی ایک طرف چند منٹ گذریں۔ اور دوسری طرف ہفتے گذرے ہوں۔

اور کئی ایسے کام ساکب نے دیکھے اور دکھائے ہوں۔ جو سُفنی میں ہونے کے
سوا چارہ نہیں رکھتے۔

ایک نکتہ

كَذٰلِكَ بَعَثْنَا هُمْ لِيَتَسَاءَلُوْا بَيْنَهُمْ۔ یہ جگانا، یہ
ہوشیار کرنا کس لئے تھا۔ صرف اس لئے کہ وہ آپس میں اس رہائش کی بابت
دریافت کر کے معلوم کریں۔ کہ کتنا وقت گذر گیا۔ حالانکہ ان کے علم میں بہت
کم تھا۔ کیونکہ ایک مزے کی زندگی میں تھے۔ مگر جب تک انہیں یہ احساس نہ
دلایا جاتا۔ کہ حقیقتاً کتنی مدت گذر گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس مہربانی کا ان کو کیا
پتہ چلتا۔ یہ صرف احساس دلانے کے لئے۔ انہیں اس حال سے نکال کر اس
حال میں لایا گیا۔ کہ وہ خدا تعالیٰ کے فضل و کرم کو تو دیکھیں۔ کہ ان پر کیا کیا
فضل و کرم ہو گئے ہیں۔ جبکہ وہ اس راہِ محبت میں آئے۔ اور دنیا کو ترک کیا۔
کسی کو دنیا میں ایک آن قلبی آرام و سکون نہیں ملتا۔ اور ان کو ہینوں سالوں
نہیں صدیوں آرام و سکون حاصل ہو گیا۔ حقیقتاً زندگیاں کیوں کم ہیں؟ اور
بیماریاں کیوں زیادہ۔ کچھ تو اس گندمی اناج کی برکت سے کچھ اس دودھ کھن
کی وجہ سے اور کچھ غم و آلام کی طفیل۔ اور کچھ اندرونی تسکین و تسلی نہ ہونے سے۔
غرض یہی امور زندگی کو ختم کرنے والے ہوتے ہیں۔ لیکن جب اندر سے پریشانی کا
جذبہ کھینچ لیا گیا۔ اور سکون و قرار قلب عنایت کر دیا گیا۔ تو اب یہ تمام دنیاوی
مصائب اور غم خود بخود دور ہو گئے۔ اور عمر خود بخود طویل ہو گئی۔

بعض سادہ خواب بھی بنا دینی ٹکھوہ میں داخل ہو کر جس دم کے طریقہ کو استعمال کرتے ہوئے ایک لمبی زندگی حاصل کر لیتے ہیں۔ اور یہاں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے وہ دولت پیدا کر دی۔ جو سالوں مجاہدہ کے بعد حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ ہاں سب سے بڑھ کر ان کا وہ مجاہدہ تھا۔ جو دنیا اور دنیا کی عیش کو اللہ تعالیٰ اور صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے لئے چھوڑ دیا۔ اور ایسے شیخ خاموش سنسان میں چلے گئے۔ جہاں دنیا کی ہوا تک نہ لگتی تھی۔ نہ کوئی جاتا تھا اور نہ کوئی آتا تھا۔ صرف یہ تھے اور اللہ میرا۔ خلوت تھی تو اس سے۔ جلوت تھی تو اس کے ساتھ۔ مونس و غمخوار صرف وہی ایک تھا۔ اس کے سوا کوئی سہارا کوئی آسرا نہ تھا۔ یہی فقر کی انتہا ہے۔ کہ تمام بھروسے دنیاوی اٹھ جاویں۔ اور صرف ایک کارساز حقیقی پر ایمان کامل ہو جاوے۔

پہلی آیت کے ساتھ کہ کیوں ڈبے پاؤں شہر میں جاویں۔ اور کسی کو خبر نہ ہو۔ کیونکہ

إِنَّهُمْ إِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ
يَرْجُمُوكُمْ أَوْ يُعِيدُوكُمْ
فَمِثْلَهُمْ وَلَكِنْ تَفْلِحُوا إِذَا
أَبَدَّاهُ

وہ لوگ اگر خبر پالیں گے تمہاری۔ تو تمہیں ماریں گے۔ یا الٹا اپنے دین میں پھیر لیں گے۔ پھر تو تم کبھی کامیاب نہ ہو گے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے۔ کہ استبداد اور ظلم کرنے والوں کی چیرہ دستیوں کتنے زور پر ہوتی ہیں۔ کہ سالوں بعد جب بھی آئے۔ تو وہی خوف مسلط ہے۔ کہ کہیں پھر مار کر الٹا اپنے دین پر آئے جاویں۔ اور ہمارا کیا کر یا ضائع نہ کر دیں۔

سبحان اللہ یہ ہے ایمان۔ اپنے وقت کا پیغمبر نہیں دیکھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے رشد کے سامان پیدا کر دیئے۔ اور ایمان کی پختگی اس درجہ پر پہنچ گئی۔ کہ گھر بار چھوڑ کر ایک کھوہ میں وقت بھی پورا کر لیا لیکن پھر بھی خوف تو اپنے ایمان ضائع ہونے کا ہے۔ اس کے بعد پھر ایک سبب اس حال کے کھولنے کا بیان فرمایا جاتا ہے۔ جیسے پہلے **كَذَلِكَ بَعَثْنَا هُمُومًا كَرِيمًا** کہ **يَتَسَاءَلُونَ فَرَمَايَا كَيْفَ تَحَايَا**۔ یہاں فرمایا جاتا ہے۔

اسی طرح خیران کی ہم نے کھول دی تاکہ
لوگ جان لیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ
حق (ٹھیک) ہے۔ اور قیامت میں
کوئی شک نہیں یعنی ضرور آئے گی۔

پہلے سبب میں بتلایا گیا تھا۔ کہ خود اصحاب کھف کی ذات کو احساس دلانا تھا۔ کہ کچھ ان کے حال میں تبدیلی ہو گئی۔ اور اس آیت میں ان کے اطلاع کی شہرت اس لئے کی گئی۔ کہ ایمان داروں کو جو اس وقت ایک دنیا توحید قبول کر چکی تھی۔ اپنے عقیدہ انحروی میں محبت ہو جاوے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا فرمودہ حق ہے۔ اور مرنے کے بعد ہم اٹھائے جائیں گے۔ اصل میں عقیدہ آخرت بے بنیاد ہو جاوے۔ تو پھر کسی عمل میں سستی نہیں رہتی۔ اور ہر عمل پوری جان سے عمل میں لایا جاتا ہے۔ یہ کس وقت شہرت نام ہوئی۔ جبکہ

وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جبکہ اس
زمانہ کے لوگ ان کے معاملہ میں باہم
إِذْ يَتَنَزَعُونَ بَيْنَهُمْ أَمْرَهُمْ
فَقَالُوا أَبْنَاؤُا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا

جھگڑتے تھے (اشرف علی)

قرآنی اسلوب یہ ہے۔ کہ کسی قصہ مثالی کو تمام بیان نہیں کرتا۔ بلکہ صرف اس حصہ کو بیان میں لیتا ہے۔ جس سے اس کے نتائجِ رشد حاصل کرنے ہوں۔ اور ساتھ ہی جب کسی واقعہ کی کڑیاں ملتا ہے۔ تو معلوم ایسا ہوتا ہے۔ کہ سلسلہ کلام کی طرح درمیان میں وقفہ نہیں لیکن امر واقع ایسا نہیں ہوتا۔ سالوں کے وقفے اور عرصے ہوتے ہیں۔

یہاں بھی وہی حال ہے۔ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوا عَلَيكُمْ
 کے حصہ کے ساتھ فوری کوئی تنازع پیدا نہیں ہوا۔ زمانہ گذر گیا۔ اصحابِ کہف زندہ تھے۔ اور پھر اپنے وقت پر تمام ختم ہو گئے۔ لیکن جیسے کہ عام فطرتِ انسانی اچھے لوگوں کے مرنے کے بعد نشانات قائم کرنا چاہتی ہے۔ یہ اسلامی قبریں بھی ایک ایسی فطرتی خواہش ہے۔ لیکن جب کوئی اہم ہستی ہوتی ہے۔ تو اس کے لئے معمولی نشانات پر فطرت قناعت نہیں کرتی۔ اور چاہتی ہے۔ کہ اس ہستی کے برابر نشان بنائے۔

”اصحابِ کہف“ عام انسانی ہستیاں نہ تھے۔ بلکہ خواص اور خدائے قدوس کے برگزیدہ ہو چکے تھے۔ اور خاص و عام پران کی پاک زندگی اور ان کے بلند مقصد کا پرچار ہو چکا تھا۔ اس لئے اس وقت کی رائے عامہ اور فطرتِ صالحہ ان کے نشان قائم کرنے کا ارادہ کر چکی۔ چنانچہ عام تجویزان کے نشان پر عمارت قبے بنانے کی ہوگی۔ کسی کو یہ خیال نہ آئے۔ قبے کہاں سے نکالے۔ سمجھانے کے لئے قبے کا لفظ لکھ دیا گیا۔ لیکن قبروں پر عمارت بنانا کیا ہوتا ہے۔ یہ ہی قبے۔ اور روحنے۔

رَبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ۔ اُن کا رب اُن کو خوب جانتا ہے (اشرف علی)
 یہ ایک ایسا جملہ ہے جس کا تعلق بظاہر سیاقِ قصہ سے نہیں۔ درمیان میں یہ
 ایک تعلیمی جملہ آگیا ہے۔ کہ وہ نشان کی عمارت بنانا چاہتے تھے لیکن ظاہری
 نشان پر ان کی حقیقتِ حال کو خیال نہ کرنا چاہیے۔ ان کا بزحیٰ حال تو اللہ کو ہی
 معلوم ہے۔ اور یہ کہ وہ کیسے گزرے۔ اور کہاں فوت ہوئے۔ یہ ”بِسِہْمِ“
 ”ان“ کا جواب ہے۔ کہ اصل قصہ کا علم تو اللہ کو ہے۔ یہ اٹکل بنا رہے ہیں۔ کیونکہ
 صدیاں گزر گئی تھیں۔

قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلٰی
 اٰمُرِهِمْ لَتَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمُ
 مَسْجِدًا
 جو لوگ اپنے کام پر غالب تھے انہوں
 نے کہا کہ ہم تو ان کے پاس مسجد
 بنائیں گے۔ (اشرف علی)

غَلَبُوا عَلٰی اٰمُرِهِمْ سے مراد غلبہ عام مفسرین لیتے ہیں۔ کہ جن کی حکومت تھی۔
 وہ رائے عامہ کے ساتھ متفق نہ ہوئے۔ چونکہ حکومت و سیدار ہو چکی تھی انہوں نے
 صرف نشانات بنانے پسند نہ کئے۔ بلکہ عبادت خانہ بنانا تجویز کیا تھا۔ کیونکہ
 موجد تھے۔ اور ساتھ ہی اصحابِ کعبہ کے ساتھ ایک نسبتِ خاصہ بھی مسجد
 کو تھی۔ اس لئے عام خیال سے ہٹ کر ایک دینی مقدس تجویز کو پیش کر دیا۔ اس سے
 یہ معلوم ہوا۔ کہ قبروں پر نشانات جو بنائے جاتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر ایک دینی
 جماعت کے لئے مسجد کا بنانا اولیٰ ہے۔ تاکہ نشان کے ساتھ عبادت گاہ کا کام
 بھی دے۔ اور لوگ وہاں عبادت کریں اور اس مقدس مقام کی برکت سے عبادت کے

ظہا یہ کہ اصل قبریں ان کی کہاں ہیں ۱۶

لطف اٹھائیں۔ اور نسبتِ خاصہ منتسبین سے فائدہ اٹھائیں۔

قصہ میں اس حصہ کا ذکر فرمانا پسندیدگی اور اظہارِ خوشنودی کے لئے کیا گیا
ورد کیا ضرورت تھی۔ کہ اس کا ذکر کیا جاتا۔ کہ بعض نے صرف عمارت کھڑی
کرنی چاہی۔ تو خواص نے مسجد کو تباہ و لاشہ بنانے کی تجویز پیش کر دی۔ چنانچہ مسجود
بنائی گئی ہوگی۔

اختلافِ تعداد

جب کوئی شہرت ہو جائے۔ تو فطرت انسانی کی خواہش ہوتی ہے۔ کہ جتنا ہر
سکے اصل حقیقت سے واقف ہو۔ اور چونکہ ایک عرصہ سے ایسے واقعات گذرے
ایسا ہو جایا کرتا ہے۔ جیسا کہ یہ خود قصہ اصحابِ کھف ہے۔ تو ان کی تعداد معلوم
کرنے پر اختلاف ہونا ضروری تھا۔ کسی نے مشاہدہ عین واقعہ اور حال کا
کیا نہ تھا۔ خصوصاً جبکہ وہ غار میں ایک خوف سے بھاگتے ہوئے اگے دگے
شامل ہوتے گئے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :-

بعض لوگ تو کہیں گے کہ وہ تین ہیں
اور چوتھا ان کا گتھا۔ اور بعض کہیں گے
کہ پانچ ہیں، چھٹا ان کا گتھا (اور یہ لوگ
بے تحقیق بات کو ہانک دیتے ہیں۔ اور
کہیں گے سات ہیں۔ آٹھواں ان کا
گتھا ہے۔ یہ لکڑی آیت انتقال کا ہے۔ اصل قصہ ختم ہونے پر ایک میانی کڑی آیت
جسے ایک گونہ تعلق ہے۔ اور ایک گونہ اصل قصہ سے بے تعلق ہے لیکن قصہ

سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَأَيْتَهُمْ

كَلْبَهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ

سَادِ سُهُمْ كَلْبَهُمْ رَجُبًا

بِالْغَيْبِ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ

وَرَأَيْنَاهُمْ كَلْبَهُمْ

کازور لگا دیتے ہیں اور رات مند اپنے شیخ کو جب تک جنید، بایزید کے ہم مرتبہ نہ بنالے سانس نہیں لیتا۔ گو عقیدت ایسی باتیں چاہتی ہے لیکن فَضَلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ پر توجہ نہیں ڈالتے۔ اور یہ بھی نہیں جانتے۔ کہ چوٹی کے افراد تو بہت کم دنیا میں ہوتے ہیں جن پر راز ہائے سربستہ کھلے ہوتے ہیں لیکن یہاں یہ ہے کہ ہر اونے اونے کے لئے غیوب پر واقف ہونا ہی فقر خیال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ فرمایا جاتا۔ فَلَا يُظْهِرُ عَلَى غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ اپنے غیب پر کسی کو واقف نہیں کرتے مگر جس پر رضا ہو۔ تو گویا رسالت میں بھی امتیاز ہے۔ چہ جائیکہ ولایت میں یہ امتیاز نہ ہو۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مرید اپنے پیر کو مجبور کرتے ہیں۔ کہ کچھ نہ کچھ ایسی باتیں کہ جن کا اُسے علم ہو یا نہ ہو۔ لیکن علم بالغیب ہونے کا اظہار ہو۔

میرے قبلہ مرشد حضرت میاں صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکشوفات اور عرفان کو کبھی بھی ایسے طریقہ پر اظہار نہ فرماتے تھے جس پر علوم و خواص کو حیرت ہو۔ اور جس سے آپ کے عرفان و کشف و تصرف کا اظہار ہو۔ بلکہ دنیا داری اور علل و اسباب ساز و سامان سے بیان فرماتے۔ تاہم جو حقیقت ہوتی ہے۔ وہ عیاں ہو کر رہتی ہے۔ آج ایک دنیا ان کے عرفان و کشف و تصرف پر ایمان رکھتی ہے۔ دھواں خود آگ کا نشان ہوتا ہے۔

دوسری ہدایت

فَلَا تَمَارَ فِيهَا إِلَّا مَوَاعِظًا
سو آپ ان کے بارے میں بجز سرسری

ظَاهِرًا

بحث کے زیادہ نہ کیجئے۔

ہر صوفی کے لئے یہ لازم ہے۔ کسی مسئلہ اور کسی گفتگو میں نہ الجھے۔ بلکہ کچھ کہہ کر خاموش ہو جائے لیکن دیکھنا یہ ہے۔ کہ امت کے رہنا اس ہدایت پر کہاں تک عمل پیرا ہیں۔ بلکہ اب تکرار و بحث ایک نیک مشغلہ خیال کیا جاتا ہے اور اس مشغلہ سے تفرقہ کتنا پیدا ہوتا ہے۔ یہ نہیں سوچتے۔ تفرقہ اور انتشار کو ہوا نہ دینے کے لئے خاموشی بہتر علاج ہے۔ مَنْ صَمَّتْ بِنَجَا۔ لیکن ہمارے علم دوست حضرات کہتے ہیں۔ کہ یہ خاموشی دین حقہ کی خاموشی ہے جسے ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن افسوس اس کے نتیجہ پر نظر نہیں فرماتے۔

تیسری ہدایت

وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِمْ مِنْهُمْ أَحَدًا
اب ان کے بارے کسی سے ان لوگوں
سے بھی نہ پوچھئے۔

یہ ہدایت کتنی پر وقار ہے۔ جب کوئی پوچھتا ہے۔ تو وہ اپنے علم اور اپنے وقتاً کو گراتا ہے۔ اس لئے خواہ اپنے اندر کتنی ہی جستجو اور رکی ہو۔ لیکن ان کے بارے عوام سے دریافت کر کے اپنا وقار نہ گرانا چاہیے۔ تاکہ دلوں پر عظمت کا سکہ بیٹھا رہے۔ خصوصاً ایسی باتوں کا جن کا تعلق شریعتِ حقہ سے نہیں اور جن کی لاعلمی سے اہل تصد اور اس کے نتائج پر فرق نہیں پڑتا۔

چوتھی ہدایت

وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ لَنْ يَأْتِيَكُم بِهِ
آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہہ کیجئے

فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا إِلَّا أَنْ
يَشَاءَ اللَّهُ۔
کہ میں اس کو کل کروں گا۔ مگر خدا کے
چاہنے کو ملا دیا کیجئے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی فعلیت اور کارکردگی کو اللہ تعالیٰ کی مشیت
کے تابع رکھا جائے۔ اور اپنا بھروسہ اپنے سے اٹھا دیا جاوے۔ اور تمام امور کی
مسراخجامی کو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات پر چھوڑ دیا جاوے۔ اور ایک خالص بندہ
حکم بردار کی طرح زندگی بسر کی جائے۔ ۵

در پس آئینہ طوطی صفت داشتہ اند

آنچه استادِ ازل گفت ہماں میگویم

کچھ ارادہ ہونہ سب اگر ارادہ میں کروں

اب آداب رسالت کو ترقی پر لیا جا رہا ہے۔ ابتداء انسان اور ہے۔

اب بلندی پر لیا جا رہا ہے۔ اور اپنے آپ سے نکالا جا رہا ہے پہلے بشریت
کے تقاضوں سے بلند کر کے الوہیت کے انوار سے بھرنا ہے۔

پانچویں ہدایت

وَإِذْ كُنَّا نَسِيْتُكَ إِذَا نَسِيتُكَ جَبَّأً بِبُحُولٍ جَائِسٍ تَوَلَّيْنَا رَبَّكَ إِذْ كُنَّا نَسِيْتُكَ

پچھلی ہدایت کے ساتھ اس کا بھی تعلق ہے۔ کہ جب کبھی آپ ان شاء اللہ

کہنا بھول جائیں۔ تو یاد آنے پر یہ الفاظ فوراً دوہرایا کریں۔ تاکہ جذبہ اعتماد نہ ٹوٹے۔

اور یہ بھی ہے۔ کہ جب کبھی ”یادِ خدا“ پر نسیان آجاوے۔ یعنی ذہن سے

”خُدائی تصور“ نکل جائے۔ تو فوراً پھر اسی تصور الہی سے ذہن کو بھر پور کر لیا جاوے۔

اور ہر کام اور ہر بات اور ہر امر کو کارسازہ حقیقتی سے خیال کیا جاوے۔ اور اپنے
اعتماد سے فوراً اعتمادِ الہی کی طرف رجوع کیا جاوے۔

چھٹی ہدایت

وَقُلْ عَسَىٰ أَنْ يَهْدِيَنَا رَبِّي لِقَابٍ قَرِيبٍ مِّنْ هَذَا رَشَدًا

اور کہہ دیجئے۔ کہ مجھ کو امید ہے۔ کہ میرا رب مجھ کو (نبوت کی دلیل
بننے کے اعتبار سے) اس سے بھی زیادہ تربات بتلائے (اشرف علی)
(ترجمہ شاہ رفیع الدین) اور کہہ شتاب یہ کہ ہدایت کرے مجھ کو
رب میرا۔ طرف نزدیک زیادہ کے اس سے بھلائی میں۔

قصہ کا جب ایک پہلو ختم ہو گیا۔ اور چھ ہدایات بھی اس کے متعلق ویدی
گئیں۔ جو شان رسالت کے مطابق تھیں۔ اور آپ سے یہ بھی کہہ دیا گیا۔ کہ
آپ ہر کام کو مشیتِ ایزدی کے تابع کر دیجئے گا۔ تو ایک ایسی بات جس کی تمنا
اور ولی خواہش قصہ کے رشد پر نبوت کو پیدا ہوتی تھی۔ کہ وہ تو جنگل میں سب
کچھ لے گئے۔ اور ایک مدت وحدت کی جھولی میں بیٹھے جھولتے جھولتے رہے
تب جا کر رشد کا پھل پختہ ہوا۔ کاشش مجھے بھی کچھ ایسا حصہ ملتا۔ اور اس سے
بڑھ کر ملتا۔

سو اس کے لئے خود ذاتِ اقدس نے پاک ذات رسالت کی تمنا اور
خواہش کو اپنے الفاظ سے نبی پاک کے زبان پر لانے کا حکم فرمایا۔ کہ اسے آپ
کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے بڑھ کر صاحبِ رشد بناویں گے۔ اور وہ

راستہ اختیار فرمادیں گے۔ جو قریب تر راہِ رشد ہے۔ از روئے تعلق باللہ اور از راہِ مجاہدہ۔ اسی ماحول میں وہ سب کچھ مہیا ہو گا۔ جو ایک دیرانے میں جا کر بھوک اور فاقہ کی زندگی بسر کرنے سے بڑا تھا۔

ایک اور بات

دیکھئے اصحاب کھف نبی نہ تھے لیکن رشد میں کیا کمی تھی۔ بلکہ خود مالک الملک ”مِنْ هَذَا“ کہہ کر اس کی تصدیق فرما رہے ہیں۔ یہ بات اہل علم بھول جاتے ہیں۔ کہ نبوت بے شک ایک بہت بلند درجہ ہے۔ لیکن ولایت کے اندر فیوضاتِ ربانی اور ہدایتِ الہیہ کی کیا کمی ہوتی ہے۔ سرسمر چشمہ نبوت کی آبیاری ہوتی ہے۔ اور نبوت کا پورا عکس جمالی و جلالی ٹپک رہا ہوتا ہے۔

اس ٹکڑے سے جہاں نبی کریم کی رشد رسالت کو بلند فرمانے کا اعلان ہے۔ وہاں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک بشارت و نذر ہے کہ ذاتِ ربی مجھ پر رشد کے بہت بلند معیار پر دروازے کھولنے والے ہیں۔ تاکہ ہمت بلند ہو اور آنے والی عنایتِ ربانیہ کے لئے کمال انتظار ہو۔

قصہ کی آخری کڑی

وہ لوگ اپنی غار میں تین سو برس تک بیٹھے

اور نو برس اوپر اودار رہے۔

وَلَبِشُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ

سِنِينَ وَازْدَادُوا سَعَاءً

قصہ کے اندر دو اختلاف بڑے تھے۔ ایک اصحاب کہف کی تعداد کا۔ دوسرا ان کے قیام کہف کی مدت کا۔ پہلے کی بابت تو کوئی فیصلہ نہیں دیا گیا۔ بلکہ تمام اختلافات کا ذکر کر دیا گیا۔ کہ تین چوتھا گٹا۔ پانچ اور چھٹا گٹا۔ سات اور آٹھواں گٹا۔ پہلے دو قول یہود و نصاریٰ کے تھے۔ تیسرا قول مسلمانوں کا تھا چنانچہ حضرت ابن عباسؓ مَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ ط کے اندر اپنے آپ کو شمار فرماتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ کہ سات اور آٹھواں گٹا ہے۔

ان کے نام روایتاً مختلف ہیں۔ صاحب قادری نے یہ تمام بیان کئے یلیچنا یکسلیٹینا۔ مسلیٹینا۔ مرٹوش۔ برٹوش۔ شادوش۔ چرواہے کا نام مرٹوش اور گٹے کا نام قطمیر۔ جو خود قرآن حکیم نے بیان فرمایا۔ عملیات والے ان کے ناموں کی برکت سے کئی فائدے اٹھاتے ہیں۔ مثلاً آگ سے محفوظ رکھنے کے لئے۔ مرگی کے لئے لکھ کر روغن زرد کے ساتھ دھو کر کانوں کے اندر لگانا۔ عقیمہ (بانجھ) کے لئے لکھ کر مکر سے بند دھوانا۔ سردی کے لئے پڑھ کر دم کرنا وغیرہ وغیرہ۔ بہر صورت پاک اور خدا پرستوں کے ناموں سے ان کے تقدس کی وجہ سے فائدہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ کوئی شرک نہیں۔ بہت بڑے بڑے علماء و فضلاء متقدمین ایسے کرتے آئے ہیں۔ شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کوئی کم شرف اپنے علم و فضل میں نہیں رکھتے۔ بلکہ سرتاج علماء و فضلاء ہیں۔ وہ خود اپنی تفسیر میں نقل فرماتے ہیں

دوسرے اختلاف میں مدت کا کئی فیصلہ دے دیا گیا۔ تین سو نو سال کی مدت غار میں ہے۔ غار نہیں کہف میں ہے۔ جسے پنجابی میں چہڑی اور گھوہ سے

تعبیر کرتے ہیں جس کا ذکر مفصلاً کر دیا گیا۔ آخر یہ کیوں کیا گیا لیکن تھوڑی سوچ کے بعد خود کھل جاتا ہے۔ کہ اصحاب کہف کی تعداد کی کمی بیشی میں قسمہ کے نتائج پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اختلاف مدت کے تعین نہ ہونے میں نتائج میں بہت بڑا فرق پڑ جاتا۔

بلکہ قصہ کی جان یہ ہے۔ "مدت دراز" کھوہ کے اندر رہنا اور زندگی کے تمام ساز و سامان سے کٹ کر زندگی بسر کرنا۔ اور کسی غیر خیال آدمی کا چہرہ نہ دیکھنا۔ اور کسی غیر سے بات چیت نہ کرنا۔ اور صرف رضائے الہی کے لئے اتنا بڑا طویل مجاہدہ اٹھانا۔ جسے موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اصل روح ہے۔ اس لئے اس مدت کی پوری تعبیر فرمادی گئی۔ اور ایک اہل فیصلہ ان الفاظ سے دے دیا گیا۔

مدت

قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوۡا
لَهُ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
اَبْصَرُۢهُ وَاَسْمِعُ مَا لَمْ
مِّنْ دُوۡنِهٖ مِنْۢ مَّا لَمْ
يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۗ اَحَدًا
آپ کہہ دیجئے۔ کہ خدا تعالیٰ کے لئے
رہنے کی مدت کو زیادہ جانتا ہے۔
تمام آسمانوں اور زمینوں کا علم غیب
اسی کو ہے۔ وہ کیسا کچھ دیکھنے والا
اور کیسے کچھ سُننے والا ہے۔ ان کا
خدا کے سوا کوئی مددگار نہیں۔ اور نہ اللہ تعالیٰ کسی کو اپنے حکم میں شریک کرتا ہو۔
اس آیت شریفہ سے پہلے بیان کی مزید توثیق کرنا مقصود ہے۔ کہ ان کے
اختلاف فائبانہ کشف و کمانت سے ہیں۔ اس لئے کلی فیصلہ کا حق تو

اللہ تعالیٰ گو ہے جس کے لئے زمین و آسمان کے کُلّی غیب کھلے ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر نہ کوئی دیکھنے والا اور نہ کوئی سننے والا۔ اس پر مزید یہ کہ اس کے حکم کے اندر کوئی شریک بھی نہیں۔ تو پھر کیوں نہ اس کے فیصلے کو تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ تمام مذاہب کا سرچشمہ وہی ذات اقدس ہے۔ تو پھر تمام اختلاف کو اس کے فیصلہ پر نسوخ کر دیا جاوے۔ اور صرف وہی فیصلہ قائم رکھا جاوے اور اس پر اعتمادِ کُلّی کیا جاوے۔

بظاہر یہ اپنے بیان کی توثیق کرنا ہے لیکن حقیقتاً یہ ساکب کے لئے ایک بت ہے۔ کہ سب سے زیادہ علم اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اور زمین و آسمان کے کُلّی پوشیدہ اس کے سامنے ہیں۔ ہر جزو اور کل کو دیکھنے والا۔ حتیٰ کہ ذرّہ بزرگ تک اُس سے پوشیدہ نہیں۔ اور ہر آواز کو سننے والا حتیٰ کہ مکھی کی بھنبھناہٹ کو بھی سنتا ہے۔ اور اس کے فیصلہ کے اندر کوئی شریک نہیں۔ یعنی اسے مشیرل نہ کی ضرورت نہیں۔

کہنے کو تو یہ عقیدہ ہر مسلمان اور ہر صاحبِ مذہب کا ہے لیکن عملاً اگر دیکھا جائے۔ تو بہت کم لوگ اس عقیدہ میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ورنہ کسی سے کیوں گناہ ہوں۔ اور کوئی کیوں اپنے علم پر بھروسہ کرے۔ اور کیوں اپنی آواز سے ایسی بات نکالے۔ جو آدابِ حق سبحانہ کے برخلاف ہو۔ اور کیوں کسی کو اپنا کارساز خیال کرے۔ اور کیوں اس کے احکام کے برخلاف چلے۔ کیا ہم رات دن اس عقیدہ پاک کے برخلاف ہر فعل ہر امر کو اور اس جذبہ مقدس کے برعکس اپنی زندگی کا شمار نہیں بنائے ہوئے؟

اسی جذبہ پاک پر توحید کا مدار ہے۔ جب یہ مکمل ہو جاتا ہے۔ تو ایک بشر بشریت سے نکل کر عبودیت کے درجہ پر آجاتا ہے۔ اور خدائے قدوس کے خواص میں داخل ہو جاتا ہے۔ جہاں یہ حکم عام ہے۔ وہاں خواص کے لئے خاص۔ رسالت کی تویہ جان ہے۔ اور رسالت کی زندگی کا مدار علیہ ہی جذبہ یا عقیدہ ہے۔ اسی وجہ سے اسے کئی بار رسالت کے سامنے دوہرایا جاتا ہے۔ تاکہ رسالت کی نظر کسی وقت بھی اس سے کم درجہ پر نہ گرے۔ اور وہ ہمیشہ ہمیشہ بلند سے بلند مقاصد پر نظر رکھے۔ وہ کیا تھے۔ وہی توحید اور اس کے اوصاف کاملہ حسن کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔

بعینہ ہی اصل ولایت میں ہے۔ جتنی توحید بلند ہوگی۔ اور اس کے اوصاف، اتنا ہی ایمان کامل ہوگا۔ اسی درجہ پر اس کے اثرات توحیدی دنیا اور آخرت میں پھلے پھولیں گے۔ لیکن آہ! مسلمان خصوصاً علمی مسلمان علمی اور عقلی توحید میں الجھ گیا۔ اور حقیقت حال سے بے خبر ہوتا گیا۔ یاد رکھئے جو ظاہر اڑ جاتا ہے۔ اس کی آنکھ باطن کی طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ چاہیے یہ کہ ظاہر کی عینک سے باطن کو دیکھا جائے اور الفاظ سے معانی اور معانی سے حقائق پر پہنچنے کی کوشش ہونی چاہیے۔ اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اِتِّبَاعَهُ۔ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اِبْتِنَابَهُ۔ اَللّٰهُمَّ اَرِنَا حَقَائِقَ الْاَشْيَاءِ كَمَا هِيَ ط

ہدایت یا حکم

وَأَنْتَ مَا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابٍ
آپ کے پاس جو آپ کے رب کی

رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ
وَلَكِنْ تَجِدَ مِنْ دُونِهِ
مُلْتَحَدًا

کتاب وحی کے ذریعہ سے آئی ہے
وہ پڑھ دیا کیجئے۔ اس کی باتوں کو
اُسکے وعدوں کو کوئی بدل نہیں سکتا۔

اور آپ خدا کے سوا اور کوئی جائے پناہ نہ پائیں گے۔

جب ”رَبِّيْٓ اَعْلَمُ“ کا جذبہ بلند پیدا ہو چکا۔ تو اب حکم ہوا کہ آپ قرآن
حکیم (جو وحی سے کتاب آئی ہے) پڑھ لیا کریں۔ خود پڑھیں اور لوگوں کو کھینچیں
کیوں؟ اس لئے۔ کہ اس کے حقائق کبھی بھی بدلنے والے نہیں۔ یہ تمام حقائق
تبدل و تغیر سے پاک ہیں۔ تو ان حقائق الہیہ کے بار بار ذہن میں آنے سے طبیعت
نبوت و رسالت میں سختگی آتی جائے گی۔ اور تقنین مستحکم و بار بار رسالت و نبوت
ہوتا جائے گا۔ اور ادائیگی تبلیغ میں آسانی ہوتی جائے گی۔ یہ ایک بڑا گڑبہ ہے۔
جو انسان خدائے حکم الحاکمین کی عبودیت پر اتر آئے۔ اور وہ چاہے کہ دنیا
اسی رنگ میں رنگی جائے تو وہ اپنے افکار بلند کرنے کے بجائے کتاب الہی کو
پڑھے۔ خود بخود اس کی تلاوت سے دل کے اندر انوار الہیہ چمک اٹھیں گے
اور انوار الہیہ کی روشنی کی وجہ سے فریضہ تبلیغ کی زمین ہموار ہوتی جائیگی۔ اور
دنیا مسخر ہوتی جائے گی۔ اقبال مرحوم نے عبودیت حقیقہ کا ایک نقشہ پیش
کیا۔ اور خوب کیا ہے۔ کہتے ہیں

نماکی و نورمی نہساد
ہر دو بہسان سے غنی
اس کی امیدیں قلمیل
بشدہ مولیٰ صفات
اسس کا دل بے نیاز
اس کے مقاصد حیل

اس کی ادا دل فسریب اس کی نگاہ دل نواز

خود سوچیے۔ جب خبر دیتا اس درجہ پر پہنچ جائے۔ تو پھر کسی کی کیا مجال کہ آنکھ اٹھائے۔ اور میر سلیم خدائے قدوس کے سامنے نہ جھکائے اور اکڑے۔ اے ماشاء اللہ۔ جن کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہو۔ اور ان کے کانوں اور آنکھوں سے حق سننے اور حق دیکھنے کی قوت ختم کر دی گئی ہو۔

اس پر مزید فرمایا گیا۔ تمام بھروسے انسانی ہستی سے اٹھائے جاویں کیونکہ ایسے آدمی کے لئے جسے ہم اپنا بناتے ہیں۔ اس کے لئے ہم کوئی دوسری جگہ پناہ نہیں چھوڑتے۔ تاکہ وہ کسی دوسری طرف دیکھ سکے۔ اور اس کی آنکھ اور دل دوسری طرف نہ ہو کر رہ جائے۔ اور پورے زور سے فرمایا گیا۔ وَ لَنْ نَجِدَ مِنْ دُونِهِ مُنْتَحِدًا۔ اُس کے سوا آپ کوئی جگہ پناہ نہ پائیں گے۔ میرے دوستو! یہ سب توجیہ کہ انسان کے اندرونی جذبات اس درجہ بلند ہو جاویں۔ کہ خود اللہ میاں اس کے اندر آ کر بول سکیں۔ کہ ہمارے سوا تمہارا کوئی سہارا نہیں۔ گویا خود اس کی اندرونی فطرت آواز دے۔ کہ اس کے سوا اس کا سہارا۔ کوئی بندوگاہ۔ یا ملجاء و ماوی نہیں۔

آخری ہدایت اور ارشاد

اور روک رکھ جان اپنی کو ساتھ ان لوگوں کے کہ پکارنے ہیں پروردگار اپنے کو
بصر اور شام کو یعنی علی الدوام چاہتے

وَأَصْرِفْ نَفْسَكَ مَعَ
الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ
بِقَدَاةٍ وَالْعَتَمِ يُرِيدُونَ

ہیں اس کی رضا مندی کو۔ اور نہ پھر
جاویں دونوں آنکھیں تیری اُن سے
ارادہ کرے تو بتاؤ زندگانی دنیا کا۔
اور مت کہامان اس شخص کا کہ غافل
کیا ہم نے دل اس کے کو یا واپسی سے
اور پیروی کی اس نے خواہش اپنی کی۔

وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ
عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ
الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِيعُ
مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ
ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَ
كَانَ امْرَأَةً فُرُطًا

اور ہے کام اس کا حد سے نکلا ہوا۔ (شاہ رفیع الدین)

اس آیت شریف کو ایک بار نہیں کئی بار پڑھئے۔ اور غور کیجئے۔ کہ جو لوگ
صاحب علم صاحب ہوش کہتے ہیں۔ کہ تصوف و فقر کی کوئی گنجائش قرآن اور
اسوۂ حسنہ میں دیکھی نہیں جاتی۔

ان کو اس آیت شریفہ کا ایک ایک ٹکڑا مطالعہ کرنا چاہئے۔

دیکھئے پہلے قصہ اصحاب کف اس حقیقت کے عیاں کرنے کے لئے
کیا کم تھا۔ اور پھر اس پر جو نتائج دکھائے گئے۔ وہ کیا کچھ اس حقیقت کو عیاں
کرنے والے کم تھے لیکن اس آیت نے اس حقیقت کبریٰ کو بالکل عیاں کر دیا۔
اور فقر و تصوف کے بنیادی اصول کو ایک آیت میں پیش کر دیا۔ اور نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر سختی سے عمل پیرا ہونے کا حکم دیا۔

آیت کے چار حصے ہیں۔ اور ہر حصہ اپنی جگہ بہت بڑی اہمیت رکھتا

ہے۔ ملاحظہ ہو۔ حصہ اول۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ

رسالت کو کس زور سے مخاطب ہو کر فرمایا جاتا ہے۔ کہ اپنی ذات کو اللہ اللہ کرنے والوں کے ساتھ جکڑ دو۔ خود سوچئے۔ یہ حکم نا ایک اور العزم نبی اور رسول کا ایک ایسے گروہ سے جو صرف اللہ اللہ صبح و شام یعنی ہمیشہ کرتے رہتے ہیں۔ کیوں ہے۔ خود ذاتِ اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مجبور کیا جاتا ہے۔ آپ اپنی توجہ کا مرکز اس گروہ کو بنائے رکھیں۔ اور ان پر توجہ قدسیہ ڈالتے رہیں۔ تاکہ یہ اور بلند ہوں (جببسا کہ ہمارے علم دوست حضرات فرماتے ہیں) دوسرا یہ ہے۔ کہ آنجناب اپنی ذات کو اس گروہ اللہ والوں کے ساتھ جوڑ دیں۔ تاکہ اس گروہ پاک کی وابستگی سے رسالت کی وہ نچنگی (یعنی یقین و ایمان) میں کمی نہ آنے پائے اور ان نفوس پاک کی برکت سے تبلیغ اپنی نشانِ بلند کے مطابق موثر ہو۔ خود سوچئے۔ کون سا جوڑ آیت کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ دونوں مطلب اکٹھے آیت شریفہ پیش کرتی ہے۔ آگ لکڑیوں کو جلاتی ہے۔ اور لکڑیاں دیندھن آگ کو روشن تر اور شعلہ زن بناتا ہے۔ بعینہ یہی حالت یہاں ہے۔ مرشد کے توجہاتِ عالیہ سے مریدین کے حلقہ میں جوش پھیلتا ہے۔ اور اور مریدین کے جوشِ محبت سے شیخ کی محبتِ قدسیہ جوش کھاتی ہے۔ ایک گونہ شیخ کا حقیقی راس المال ہی فقرا اور مریدین ہوتے ہیں جن کے بل بوتے پر تمام کارخانہ ہدایت چلتا ہے۔ اور جس سے ہدایت اپنے ثمراتِ کاملہ سے پھلتی پھولتی ہے۔ اب خود سوچئے۔ کہ جن بے کاروں کا کلمہ کیا جاتا ہے کہ یہ بیکار بلا مطلب و بلا مقصد اللہ اللہ کرتے ہیں۔ اور دنیاوی کاموں سے الگ ہو کر قوم پر ایک بوجھ ہیں۔ ان کی اہمیت خود سوچئے اللہ تعالیٰ کے نزدیک

کتنی ہے۔ اور اللہ کے رسول کے ہاں کتنی وقعت ہے جس کے سوا فرضاً تبلیغ پورے طور پر روشن نہیں ہو سکتا۔ ورنہ کیوں اس اہمیت سے **وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ** کے ساتھ ارشاد عالی ہوتا۔

رَبِّهِمْ بِالْعَدْوَةِ وَالْعَشِيِّ کہ اپنے رب

کو صبح و شام پکارتے ہیں۔ یعنی رات و دن۔

دنیا دار اور دنیاوی علوم کے ماہر ذکر اللہ کو ایک بیکاری خیال کرتے تو

ان کا حق تھا۔ کیونکہ انہیں حق سے واسطہ نہیں۔ بلکہ دنیا سے جو چیز اور جس کام

سے دنیا پیدا نہ ہو۔ وہ ان کے نظر میں عبث۔ وہ انسانیت اور انسانیت کے

مصالح پر توجہ نہیں دیتے۔ بلکہ ان کے نزدیک انسانی مصالح کی تمام جڑ دنیا

ہے۔ اور دنیا کے اسباب سے فائدہ اٹھانا۔ اور جتنے ساز و سامان دنیاوی سے

زیادہ فائدہ اٹھائے۔ ان کے نزدیک وہی بلند ترین اخلاق کا مالک ہو۔ اس کے

لئے زنا بڑا نہیں فسق و فجور کے تمام آئین اس کے لئے مباح۔ ہاں وہ راہ ان کے

لئے مسدود اور بند ہے۔ جس سے پیسہ نہ کمایا جاوے۔ دنیا کو جہنم میں جھونک

دیا جائے لیکن ان کی آن نہ جائے۔ یہ ان کا بلند اخلاق شمار ہوتا ہے۔ اپنے مطلب کے

حاصل کرنے کے لئے ہر مکر و فریب کی اجازت۔ ایک ویل پیشہ کے لئے حد

سے بڑھ کر جھوٹوں سے اپنے مقدمہ کی پیروی اور پھر جھوٹ کے بل فتح کرنا ان

کا سب سے بڑھ کر فخر اور اخلاق ہے۔ ایک مہربان ویل صاحب ایک مجلس میں

فرمانے لگے۔ کہ جب کسی دن زیادہ پیسے کماتا ہوں۔ تو زیادہ لذت نماز میں آتی

ہے۔ نماز کی لذت اور خدائی قرب تو کیا ہوتا ہوگا۔ دنیاوی مستی ضرور ہوتی ہوگی

جس کی وجہ سے ان کی نماز معراج مومنین کا درجہ حاصل کو تہی ہوگی۔

لیکن کیا کہا جاوے۔ ان عالمان دین کے حق میں جو سراسر اپنی زندگی کو اپنی زندگی بنانے میں مصروف و مشغول ہیں۔ کہ ان کے اندر دنیاوی وسوسوں نے ایسا گھر کیا ہے۔ کہ صریح احکام شریعت اور صریح بیان قرآن کے بعد بھی دنیاوی حجاب ان کے دلوں پر برابر لٹک رہا ہے۔ اور اس ٹکڑے اور اس جیسے فقرات قرآنی پر توجہ نہیں کرتے کہ ذکر اللہ کی کیا اہمیت ہے۔ اور کس درجہ قرب الہی اس سے حاصل ہوتا ہے۔ پھر اس ذکر اللہ کا مقصد بھی مولیٰ کریم نے خود واضح فرمایا کہ کوئی دنیاوی فائدہ مقصود نہیں۔ بلکہ دینی مصالح سے بھی بلند مقصد۔ خود اس کی ذات اقدس (یُرِيدُونَ وَجْهَهُ) ہے۔ لیکن بڑا ہو دنیاوی محبت کا کہ اب دین کو بھی دنیاوی استواری کا نام لے رکھا ہے۔ اور عبادت جیسی پاک پرستش ذات کو دنیاوی فلاح کا چربہ دیا جاتا ہے۔ فَوَيْلٌ لَّكُمْ مِمَّا كَتَبْتُمْ أَيُّدِيَهُمْ وَيَوْمَئِذٍ تَلَهُمْ قِيمَاتُكَ يَكْسِبُونَ۔ سچ فرمایا اس ذات اقدس نے جس کے لئے زمین و آسمان پیدا کئے گئے۔ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيئَةٍ کہ دنیا ہر گناہ کی جڑ ہے۔ اس سے بڑھ کر دنیا کی کیا بڑائی ہے۔ کہ دین الہی کو بھی دنیا کے لئے گھڑ دیا۔ اور اس کی پرورش کے لئے دنیاوی فلاح اور دنیاوی سامان کے دینی فرائض کا رخ پھیر دیا۔ روزہ کیا ہے۔ انفرادیت کے بھوک دکھانے کے لئے۔ اس لئے نہیں۔ کہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔ تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ نماز کیا ہے۔ ایک پریڈ ہے۔ اور عسکری تنظیم کا ابتدائی درجہ۔ اللہ اکبر سوید بجا اگر سوچا جائے تو دین الہی کو کہاں لے جا رہا ہے۔ سراسر دنیا کے جہنم میں بھونک

نہیں رہا ہے۔ اس پر فخر کیا جاتا ہے۔ کہ ہم دین کی آبیاری کر رہے ہیں۔ اور دین کی سرکندی کے لئے سر و سر کی بازی لگا رکھی ہے۔ ۲

کیں یہ کہ تو مسیرومی بن کرستان است

کہنے والا کوئی نہیں رہا۔ اور پھر کہا جاتا ہے۔ کہ کوئی آئے اور ہمارے سامنے دلائل و براہین کے ساتھ ٹھنڈے دل سے تباہ و خیالات کرے

خود سوچئے۔ جب طرز فکر اس درجہ پر پہنچ جائے۔ تو ان سے کوئی کیا بات کرے۔ جبکہ خود (وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ) کے مطابق ہو چکے ہوں۔ اللہ تعالیٰ خود ہی اپنے بیکس دین پر رحم فرمائے۔ تو شاید کوئی صورت کبھی ایسی ہو جائے کہ اصل اصل ہو جائے اور نقل نقل۔

علماء تو گئے تھے۔ لیکن صوفیا کی ہنڈیا میں بھی اب کوئی جوش نہیں جس ہنڈیا کے نیچے سوز و ساز کی آبیج نہ ہو۔ وہ کب بھلا جوش میں آسکتی ہے۔ اور کب اس کے سالن کو کوئی کھا سکتا ہے۔ اور کوئی کھائے بھی تو کچا بد مزہ۔ نہ بوزہ وائقہ۔ ہاں جس کو فطرتی لگن ہو۔ وہ کسی قدر اس سے پیٹ بھر لے گا۔ لیکن کھانے کے بعد جب کچا ہونے کی وجہ سے پیٹ میں درد ہوگا۔ تو ہنڈیا والے کو کیا کہے گا۔ لعنت نہ بھیجے گا تو بے چارہ کیا کرے گا۔ وقت بھی گیا۔ محنت بھی گئی۔ اور پیل بھی نہ پایا۔ وہی کچے بیر۔ یا کھٹے انگور۔ پھر وہی بارگاہ الہی میں عرض ہے۔ کہ اللہ العالمین! تو ہمارے دین پر جسم فرما۔ اور جیسے گن سے تو نے دنیا کو پیدا کیا۔ اسی طرح ایک دوسرے گن سے اس دین کو تازہ فرما۔ اور اپنا کوئی ایسا بندہ پیدا فرما۔ جس کے سامنے یہ دنیا سحر ہو جاوے۔ اور اس کی ایک جھلک سے دین روشن

ہو جاوے۔

آیتہ کا تیسرا ارشاد | وَلَا تَعُدُّ عَيْنُكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ

الدُّنْيَا (ترجمہ) دنیاوی زندگی کی رونق کے خیال سے آپ کی آنکھیں (سینے
توجہاتِ محبت) ان سے ہٹنے نہ پائیں۔

واصبر کے جملے میں ارشاد ہوا تھا۔ کہ ان لوگوں کے ساتھ جو اللہ کرنے

والے ہیں۔ بیٹھا کریں۔ جو صرف رضا الہی چاہتے ہیں۔ اس ٹکڑہ میں مزید عنایات

فرمائی جا رہی ہیں۔ کہ ایسے نہ ہو۔ کہ دنیاوی زندگی کی رونق اور خوش حالی کو مد نظر

رکھتے ہوئے آپ کی ولی توجہ ان سے اٹھ جائے۔ اور آپ کامرکز عنایت کوئی

اور دنیا کا بندہ ہو جاوے اس ٹکڑہ سے وہ تمام خیال باطل ہو جاتے ہیں۔ جو آج دنیا

کو برکزیہ اور ضروری بنانے کے لئے دینی روایات پیش کئے جاتے ہیں اور دنیاوی

فلاح اور دنیاوی تمول کی زندگی جائز ہی نہیں بلکہ ضروری بنانے کے لئے پیش کئے

جاتے ہیں۔ اللہ اللہ کرنے والے کون تھے، بیٹھا تھے۔ بے گھر تھے۔ لوگوں کے

صدقے سے پیٹ پالتے تھے۔ جنہیں اس وقت کی اصطلاح میں اصحابِ صفہ

کہتے ہیں۔ جو سر مشرقی بارگاہِ ایزدی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر

پڑے رہتے تھے۔ اور ان کے سوا کوئی سروکار ان کو دنیا اور دنیا کے وسائل اور

ساز و سامان سے نہ تھا۔ اور وہ اسی میں اپنی زندگیاں ختم کر گئے۔ آج بھی بعض

خانقاہوں میں یہ سلسلہ سنت اللہ کے مطابق چلا آتا ہے۔ کہ خانقاہ میں کچھ لوگ

ایسے تعلیم دیتے ہیں۔ جو صرف اللہ کی رضا کے لئے شب و روز اس کے ذکر میں رہا

کرتے ہیں۔ اور دنیاوی گھنٹیوں میں نہیں پڑتے۔ کیوں۔ اس لئے نہیں کہ وہ کوئی

اس آیت یا اس جیسے اور آیاتِ الہیہ کی طرف توجہ نہیں فرماتے۔ کہ خالق الارض
والسموات ان کے بارے کیا رائے کا اظہار فرما چکے ہیں۔ اور کہاں تک انہیں
گروہ محبوب ہے۔ ان کے بارے ایک اور آیت ہے۔

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا
فِي الْأَرْضِ يَجْسِبُهُمُ الْجَاهِلُ أَعْيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ
بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِحْفَاطًا وَمَا تُفْقُوا مِنْ

خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ تَرْجَمَهُ (صدقات) اصل حق ان
فقیروں کا ہے۔ جو مقید ہو گئے اللہ کی راہ میں۔ (اور اسی وجہ سے) وہ لوگ

کہیں ملک میں چلنے پھرنے کی (عادة) امکان نہیں رکھتے۔ اور ناواقفان کو دو

(تو لگ کر) خیال کرتا ہے۔ ان کے سوال نہ کرنے کے سبب سے (البتہ) تم ان

کے (ظن) چہرے سے پہچان سکتے ہو۔ کہ فقر و فاقہ سے ہر چہرہ پر اثر ضرور آجاتا

(بقیہ حاشیہ ص ۶) ایسی نماز کو سلام یا نہ ہو نماز ہو

۵ صد کتاب و صد ورق درنا کن روئے خود را جانبِ دلدار کن

اور وہ ارشاد الہی اور اسوۂ حسنہ کے مطابق جواب کے بجائے ہمیشہ صبر سے

رہے۔ اور عبادتِ الہیہ میں پہلے سے زیادہ مصروف ہو جاتے ہیں۔

لیکن الفسوس صوفیت اپنے اعلیٰ مقام سے زمانہ کے ہیز پھیر سے گری ہوئی ہے۔ اور

ہمارے متصرفین بجائے خاموشی و صبر اور عبادت کے توڑ اور میں میں پراترائے ہیں اور

جواب ترک کی بات کی دنیا فخر محسوس کرتے ہیں۔ اس عاجز کے نزدیک یہ سب کچھ عبث ہے۔

بشرطیکہ حقیقتِ تصوف کو اگر بلند دیکھنا مقصود ہو۔ تو اس کے لئے وہی طریقہ احسن

اختیار کیا جائے۔ تم جانو۔

ہے اور لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔ اور جو کچھ مال خرچ کر دے بے شک حق تعالیٰ کی اس کی خوب اطلاع ہے۔ (تھانوی)

دیکھئے کس محبت بھرے انداز میں ان فقرا کی تعریف کی گئی۔ جو اس کی محبت میں طمرے ہوئے پڑے ہیں۔ اَحْصِرُوا رِئِي سَبِيلِ اللّٰهِ اس پر اکتفا نہیں فرماتے ہیں لَآ يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ وہ زمین پر چلنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ بڑھاپے کی وجہ سے نہیں بلکہ محبت و عشق کی وجہ سے پھر انھیں حال کا کیسا بلند مقام پایا۔ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاءَ۔ جو ان کے حال سے واقف نہیں وہ تو ان کو دولت مند خیال کرتا ہے۔ لَآ يَسْئَلُونَ النَّاسَ اِحْتَاٰفًا۔ وہ لپٹ کر نہیں مانگتے۔ لپٹ کر کے۔ یہ خیال نہ کیا جاوے۔ کہ وہ مانگتے تو تھے۔ بلکہ عام سائل چونکہ لپٹ کر مانگنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس لئے لفظ اِحْتَاٰفًا کا بڑھا دیا گیا۔ ورنہ اصحاب صفہ کہاں مانگتے تھے۔ خود ہی کسی کو ان کی بھوک کا احساس ہوتا تو کچھ پیش کر دیتا۔ يَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ان کی طرف توجہ دلاتے۔ جب فاتے پر فاتے آجاتے۔

پھر اس جملہ وَمَا تَنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهِ عَلِيْمٌ ط کتنے درجہ اس صدقہ کو بلند کرایا۔ جو ان پر کیا گیا۔ ورنہ کس مسلمان کو یقین نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے لیکن اس صدقہ کی حقیقت کے بلند کرنے کے لئے یہ ارشاد فرمایا۔ جو مال ان پر خرچ کر دے اس کے ہم خوب واقف ہوں گے۔ تاکہ لوگ ان پر غیب کرنے کی طرف متوجہ ہوں۔

غور فرمائیے۔ اس آیت نے ایسے فقرا کو جو اللہ تعالیٰ کی چوکھٹ پر دھرنے والے

بیٹھ گئے ہیں۔ کیا درجہ دیا ہے۔ اور اس درجہ میں کوئی دوسری جماعت شامل ہو سکتی ہے؟ جن کے اخراجات اور ضروریات کے لئے ایسے پاک الفاظ سے مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی ہو۔ اور ایسے محبت بھرے الفاظ سے ان کی مجبوری فی سبیل اللہ کو ظاہر فرمایا گیا۔ میرے دوستوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ احصار فی سبیل اللہ وہ نہیں جس کے لئے ہمارے دوست دعوت دیتے ہیں۔ وہ بھی زبانی عملاً ہی کچھ۔ جو کچھ ہم گناہ گار ہوتے ہیں یعنی ٹس سے مس نہ ہونا۔ اور زبانی لٹکار پر لٹکارینا۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی نے اپنا تفسیری نوٹ اس ٹکڑے پر ترمیم زینۃ الحیوة الدنیاء پر دیا۔ جسے ہم اجاب کی خدمت میں پیش کر کے التجا کرتے ہیں۔ کہ وہ اس پر غور فرمائیں۔ ”مرشد تھانوی نے فرمایا کہ اغنیاء کی طرف میل و تواضع جس کی بنیاد ان کا غنا ہو آیتہ اس کی مذمت میں ہے۔ یہ آیت آجکل کے بہت مصلحین کے لئے قابل غور ہے۔ آج ہر اصلاح پر زور (خواہ وہ عقاید سے متعلق یا اعمال سے) سب زیادہ اسی پہلو سے دیا جاتا ہے۔ کہ اس سے مسلمانوں کی مالی و معاشی حیثیت جائے گی۔ یا اس سے مسلمان سیاسی اقتدار حاصل کر لیں گے۔ وقس علیٰ هذا غرض مقصود ”بہ اصلاح“ کسی نہ کسی پہلو اور اعتبار سے یہی دنیا اور اس کی سر بلندیاں رکھی جاتی ہیں۔

تعلیم قرآنی اس ذوق فاسد سے کس درجہ کرتی ہے؟ (پارہ ۱۵ ص ۱۲۸)
 ”زہرۃ الحیوة الدنیاء“ کی حقیقی قدر اسلام کی نظر میں دکھانے اور دیکھنے کیلئے ایک اور آیت شریفہ سورہ طہ کے مکملہ کے طور پر آئی ہے اسے ملاحظہ کرنا چاہیے۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَكَ إِلَىٰ مَا
مَكَّنَّا لَهُ أَرْوَاجًا مِنْهُمْ
زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا
آرائش و نیوی کی آرائش دے رکھی ہے۔ اور اسے دولت مند بنایا ہے۔ کیوں
لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ۔ تاکہ ہم انہیں اس دنیاوی زندگی کی آرائشوں اور دولتوں
میں آراویں۔

وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ
ریا رکھیں) کہ پروردگار کا رزق دیا ہوا
بہت اچھا ہے۔ اور دیر تک سلامت رہنے والا ہے۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو دنیاوی آلائشوں سے پہلے بھی
پاک تھے۔ اور جو معصوم تھے! انہیں یہ تعلیم دی جا رہی ہے۔ کہ آپ کی توجہ دنیاوی
مال و متاع والے انسانوں کی طرف ہرگز نہ ہو۔ تاکہ آپ کے دل میں دنیاوی
زندگی اور رونق کا دوسوہ نہ پڑ جائے۔ تو ایک ہم جیسے دنیا پرستوں کے لئے یہ حکم
یہ ارشاد کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ اور بچہ اگر رکھتا ہے۔ تو ہم کہیں خواہشات نفسی میں
پڑ کر آیات محکم کی تاویلات پر اتر پڑتے ہیں۔ "وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ" کہ
کر دنیاوی سامان و آرائش کو کس درجہ پر ٹھکرا دیا گیا۔ اور لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ
فرما کر دنیاوی تعیش کی حقیقت کھول دی ہے۔ کہ یہ تو ایک آزمائش جنہی بنانے
کی ہے۔ پھر اس آزمائش اس توجہ الی الدنیا سے بچنے کے لئے ایک مستبادل
تجزیہ فرمائی۔

وَأَمْرًا هَلَّاكَ بِالصَّلَاةِ
اپنے متعلقین اور اپنے لوگوں کو نماز کا

وَأَصْطَبِرْ عَلَيْهَا۔

حکم دیتے ہوئے اور صبر کیجئے اس

یعنی خود بھی پابند رہیے گا۔

یہ آپ کی توجہ کا مرکز خود نماز کی طرف توجہ فرما۔ یعنی عبادت خدا کی طرف۔

اور یہی ارشاد اپنے متعلقین منتسبین کے لئے ہوتا رہے۔ تاکہ یہ جذبہ عبادت

اللہ مصمم ہو جائے۔ اور توجہ الی ما سواہٹ جائے۔ کیوں لَأَنْتَ لَكَ رِزْقًا

ہم آپ سے رزق کمرانا نہیں چاہتے۔ یعنی ہم نے آپ کو رزق کمائی کے لئے انتخاب

نہیں فرمایا۔ بلکہ اور کام کے لئے جس کے لئے ارشاد ہو رہا ہے۔ منتخب فرما کر

مبعوث فرمایا گیا۔ کیوں مَخْنُ نَرْزُقُكَ ہم آپ کو رزق دینے والے ہیں۔

یعنی ہم رزق دے رہے ہیں۔

ایسی صبرت سے بھی تمہاری کمائی سے کیا فائدہ۔ جب ہم خود رزاق ساری

کائنات کے ہیں۔ بلکہ ہمارا مقصد تو یہ ہے۔

وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَى۔ کہ پرہیزگاری کا انجام ہی بہتر ہے۔

یعنی آپ پرہیزگاری پیدا کریں۔ اور آخرت پر ایمان محکم بنانے کا کام اپنے

ذمہ رکھیں۔ ان آیات کے پچھلی طرف کی آیت ملاحظہ ہو۔ تو اس حقیقت کو آپ

واضح پائیں گے۔ فرماتے ہیں۔

جو کچھ دباتیں لوگ کہتے ہیں۔ ان پر صبر

فرمائیے اور تعریف کے ساتھ تسبیح

کیجئے۔ آفتاب نکلنے اور غروب ہونے

سے پہلے۔ رات کی گھڑیوں اور دن

فَأَصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَ

سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ

طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ

غُرُوبِهَا وَمِنْ أَنَاءِ اللَّيْلِ

سَبَّحَ وَ اطَّرَافَ الشَّهَادِ
مَلَائِكَ قَرَضَى - کیا کریں کیوں اس لئے کہ اس پر

آپ خوش ہو جائیں گے۔ یا خوش رہیں گے۔

عبادت جو سب سے زیادہ اثر پیدا کرتی ہے اور ساتھ ہی اندرونی انشراح پیدا کرتی ہے وہ رضا بقضایا رضا بمقدرات ہے جس کی وجہ سے دنیا و نافیہا سے

بے نیازی ہو جاتی ہے۔ اور جو حقیقی سامنے رہ جاتا ہے۔

مقصود بھی ان آیات سے یہی ہے۔ کہ رسالت اس تسبیح و تہلیل کے سوا اپنا بھروسہ کسی پر نہ رکھے۔ اور اپنے جہد و جہد کا نقطہ مرکزیت یہی عبادت الہیہ شب و روز اور ہر گھڑی و ہر آن۔ اور اس کے اندر کامل انہماک ہو۔ تا آنکہ۔
وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلاً اور انقطاع عن الدنيا کامل ہو جاوے۔

بعض لوگوں کو دھوکا ہو گا۔ کہ آپ تو سارے کام کاج دنیاوی کرتے تھے۔ اور تمام دنیاوی معاملات میں دلچسپی لیتے تھے۔ اول تو یہ رسالت کے اتمام بعد میں یہ بوجھ دنیاوی بھی چٹا دیا گیا۔ ورنہ ابتداء ہی کچھ رہا۔ کہ توجہ ذات الہی کے سوا کسی طرف بھی نہ دلائی گئی۔ اور بعد میں بھی اصل دین ہی قرار دیا گیا۔ باقی تمام امور زندگی فروعات اور ثانویہ درجہ پر ہے۔ آپ کی تمام زندگی کا مطالعہ فرمائیے۔ کس درجہ انہماک ہمیشہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عبادت الہیہ میں رہا۔ اور ہر آن اور ہر وقت آپ کی زبان پر تسبیح و تہلیل اور ایسے جملے چلتے رہے۔ جو عبودیت کے شان اقدس کو بڑھانے پر سیر آتے تھے۔ اور جو حقیقی

سے ہر دو جہان سے غنی اس کا دل بے نیاز

کی جلوہ آرائی کا پتہ دیتے تھے۔ اور اسی پر مدار رسالت کا تھا۔ اور تمام عمارت دین اسی عبادتِ ذوقیہ پر کھڑی ہوئی۔ یہ مفلسی و ناداری ہی مسلمان ملت کا سرمایہ تھا۔ اور اسی مفلسی و ناداری نے جلوۃ الہیہ کے درخشان نظارے مسلمان کے دلوں پر کھول دیئے۔ اور اسی مفلسی و ناداری کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمان زندگی کا شعار بنا چاہتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اَحْيِيْتَنِيْ مُسْكِيْنًا وَّ اَمِيْتَنِيْ مُسْكِيْنًا وَّ اَحْشُرْنِيْ فِيْ زَمْرَةِ الْمُسَاكِيْنِ۔ اے اللہ تو مجھے مسکین زندہ رکھ۔ اور مجھے مسکین مار۔ یعنی مسکینی کی موت دے۔ اور مجھے مساکین کے گروہ میں اٹھا لے۔ سورۃ طور میں فرمانے ہیں۔

وَاَصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ
بِاَعْيُنِنَا وَّ سَبِّحْ بِحَمْدِ
رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ وَّ مِّنَ
الْبَيْتِ فَسَبِّحْهُ وَاِذْ بَارَكُ
النُّجُوْمَ

اور آپ اپنے رب کی اس تجویز پر صبر سے
بیٹھے رہیے۔ کہ آپ ہماری حفاظت میں
ہیں۔ اور اٹھتے وقت (مجلس سے) یا سونے
(سے) اپنے رب کی تسبیح و تحمید کیا کیجئے
اور رات میں بھی اس کی تسبیح کیا کیجئے۔

(مثلاً عشاء) اور ستاروں کے پیچھے بھی۔

ان آیات کے پیش کرنے سے ایک مقصود تو یہ ہے۔ آنکھوں میں رہنے
اور آنکھوں کے پھیرنے۔ اور آنکھوں کے لمبا کرنے کی حقیقت اپنی اپنی جگہ
واضح ہو جائے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے۔ کہ ہمارے دوستوں کے اس
اعتراض کی حقیقت کھل جائے۔ جو ہر صورت میں عبادت کے معافی کو نوٹ موڑ
کر کے اس کے مفہوم کو ساری زندگی کے امور پر حاوی کرنے میں مصروف رہتے

ہیں۔ اور ساتھ ایک مسکین زندگی اور یادِ الہی کی زندگی کو ایک مسلمان زندگی تصور نہیں کرتے۔ بلکہ ان کے نزدیک اصل مسلمان زندگی وہی ہے۔ جو سیاسی زندگی میں اقتدار کی زندگی ہو۔ اور دولت و سامان کی زندگی ہو۔ اور یہی اصل منفعتِ اسلام خیال کرانے میں مصروفیت کی زندگی ہو۔

موجودہ وقت کے مسلمان دینی جماعتوں کا ادب (لٹریچر) پڑھیں اور پوری توجہ سے پڑھیں۔ پھر غور کریں۔ کہ ان تمام تحریر کا محور کیا ہے۔ اور وہ جماعتیں کیا چاہتی ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس ذوقِ عبادت اور اس تخیلِ ذاتِ الہیہ کی یاد کا بھی نشان واضح یا غیر واضح ملتا ہے۔ کہ مسلمانوں کو ان کی طرف بھی توجہ اس سے بڑھ کر کرنی چاہیے۔ جو مسلمان کی اصل اساس دین ہے۔ اور جس پر اسلام کی تمام عمارتِ شریعت کی بنیاد ہے۔ ورنہ ہم دنیاوی امور کی شرکت ناجائز قرار نہیں دیتے۔ بلکہ عوام کی زندگیوں کو اس سے وابستہ دیکھتے ہیں۔ صرف ہم یہ چاہتے ہیں۔ کہ اصل منصب رسالت کے تابع اور رسالت کے فریضہ تبلیغ کے سنبند پر بیٹھنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے کیا لائحہ زندگی ہونا چاہیے۔ انہیں تو **خُنْ نَزْفُكَ** کے نشہ سے مست ہو کر تمام دنیاوی امور سے دست کش ہونا چاہیے۔ نہ یہ کہ جو اللہ کے بندے اس نشہ توکل سے بھر پور ہیں۔ ان کی پھبتیاں اڑا کر عوام و خواص کو ہٹانے پر دین کی مدار خیال کی جائے لیکن وہ ہمیں جانتے۔ کہ اُس کا اثر اٹھانے سے بدگمانی کا پیدا ہوتا ہے۔ اور عوام و خواص متنفر ہوتے ہیں۔ اور اللہ کے بندے تو ان کی اس پریشانی اور غوغائی سے ذرا پریشان نہیں ہوتے۔ بلکہ اُن کو دکھ ہوتا ہے کہ عالمِ باعمل کیوں

بتہ فائدہ وقت ضائع کر کے اصل کام کو کھٹائی میں ڈال رہے ہیں۔
 اگلے دن ایک زمیندار آیا۔ اور اس کے برخلاف بعض نے کوشش کی۔ کہ
 اوس کی نمبراری کی زمین چھن جائے لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے۔ اس پر اُس جاہل
 نے عرفی کا ایک شعر بر محل پڑھ دیا۔ ایک تو حیرت ہوئی۔ دوسرے اپنے حال
 کے مطابق پایا۔ اور خوب کیف آیا۔

عرفی تو میندیش زخوفائے رقیبیاں

آوازِ سگاں کم نکتِ رزقِ گدرا

پاک لوگوں اور جاہل توکل کے رزق کو کون روک سکتا ہے۔ جب وہ خود
 عنایت کرنے والے ہوتے ہیں۔ جن کے در پر کٹنے کی طرح ہمیشہ پڑنے کو عمر
 بسر کرنا فخر محسوس کرتے ہیں۔ اور اپنی زندگی اُس ذاتِ اقدس کے در پر ایک
 انتظار میں بسر کر دیتے ہیں۔ اور حاشی **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ**
 ہوتے ہیں۔

ہمارے بزرگوں کی رقابت بھی بے معنی ہے۔ یہ اور۔ اور وہ اور۔ ورنہ
 کے میدانِ جہاد الگ الگ۔ اقبال مرحوم نے خوب فیصلہ دیا ہے
 رقابت علم و عرفاں کی غلط فہمی ہے۔ منبر کی
 کہ وہ منصور کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا
 آیات صبر و استقامت کے ساتھ آیات ذیل بھی ملاحظہ فرمائیے تاکہ مطلب
 زیادہ روشن ہو جاوے۔

۱۔ **وَلَقَدْ نَعَلْنَاكَ يُضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ فَسَبِّحْ**

يَحْمَدُ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ ۝ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ
يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ۝

۲۔ وَأَصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ
فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ۝ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ
هُمُ أَحْسَنُونَ ۝

۳۔ فَأَصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ
الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ
۴۔ وَأَصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ۝

۵۔ فَأَصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَطِعْ مِنْهُمْ شَيْئًا أَوْ كَفُورًا
وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ لَهُ
وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا ۝ اس کے بعد فرماتے ہیں اِنَّ هُوَ لَا يُخَيَّبُونَ
الْعَاجِلَةَ۔ یعنی یہ لوگ تو دنیا کو پسند کرتے ہیں۔ اور آپ آخرت کے حصہ دار
ہیں۔ اس لئے آپ ذکر اللہ اور سبج و تہلیل میں وقت بسر فرمایا کریں اور دنیاوی
گھمبیلوں میں نہ پڑا کریں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدا اور انتہا کا زمانہ بڑا صبر آزما ہے۔ طرح
طرح کی باتوں سے آپ کی ذات اقدس کو دکھ پہنچائے جاتے تھے۔ ایک نبی
اولو العزم رسول کو ایک کاہن۔ ایک ساحر اور ایک مجنون کہنے سے دل کو کتنا
وہم ہوتا ہوگا۔ اور کتنا سینہ تنگ ہوتا ہوگا۔ جبکہ ظاہری عداوت سے
بھر توڑ کا لہر جاری جا رہی ہوں۔ اور پھر اللہ کے یہ چہرے کے لئے اللہ

رؤف الرحیم کی تلقین کسی بلند پایہ اخلاق کو لٹے ہوئے اور شفقت بھرے الفاظ و عبارات سے تسلی و لا رہی ہے۔ اور ہر موقعہ صبر کی تلقین کے ساتھ دعوت الی اللہ بصورت عبادت و تسبیح و تہلیل و ذکر اللہ ہوتی ہے۔ اور پھر صبر کے پیدا کرنے کے ساتھ انہماک عبادت کا حکم ہوتا ہے۔ کیونکہ صبر عبادت سمجھو و رکوع اور تہلیل و تسبیح کے سوا قائم رہنا ناممکن ہے۔ اس کے ہر موقعہ کے ساتھ عبودیت مشفقہ پر اتر آنے کا حکم ہے۔

صوفی کو کسی جھگڑے میں نہ پڑنا چاہیے

منقذین صوفیہ بھی اسی پر رہے۔ ہمیشہ آپ کو ہر طرح کی تکلیفیں انبیاء سے بڑھ کر، اپنوں سے رہیں۔ اور بے دین و مشرک کے الفاظ استعمال ان کے بائے ہونے سے۔ اور وہ بے دھڑک اپنے کام اور اپنی مشغولیت ذکر اللہ میں پراہ صروف ہے۔ اور کسی کو ایک لفظ جواباً کہنا پسند نہ کیا۔ اب بھی صوفیت کے لئے یہ طریقہ سلف رحمہم اللہ کا قائم رکھنا چاہیے۔ تاکہ اس جھگڑے اور جدال میں اپنے اذواق و اشتواق سے بے بہرہ نہ ہونا پڑے اور وَذَرْنِي وَالْمَكَدَّ بَيْنَ رِجْجِي مَجْهُورٌ و سے اور ان کو یعنی ہم خود نمٹ لیں گے۔

اب آیت کے دوسرے حصہ پر توجہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ
عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَ
كَانَ أَمْرًا فُرُطًا
مست کہرا مان اس شخص کا کہ غافل کیا
ہم نے دل اس کے کو یا واپسی سے اور
پیروی کی اس نے خواہش اپنی کی اور ہے

نام اس کا حد سے نکلا، ثور، شاہ رفیع الدین،
دوسرا ترجمہ: اور اس شخص کا کہنا نہ مانئے جس کے قلب کو ہم نے
اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے۔ اور وہ اپنی خواہشاتِ نفس پر چلتا ہے اور
اس کا یہ حال حد سے گذر گیا ہے۔

اس حصہ کے چار حصے ہیں۔ پہلا اطاعتِ مذہبی کی جائے۔ دوسرا جس
کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا۔ تیسرا وہ اپنی خواہشات کا تابع
ہو گیا۔ اور چوتھا اس کا کام حد سے گذر گیا۔

حقیقتاً چوتھا حصہ دوسرے کا ایک جزو ہی ہے۔ تصوف میں قلب۔
ذکر اور ہوا کو بڑی اہمیت ہے۔ اور اگر غور کیا جاوے تو تصوف کا مدار ہی
ان امور پر ہے۔

قلب۔ یہ صرف اس کو تھڑے کا نام نہیں جو دل کے نام سے ذکر کیا
جاتا ہے۔ بلکہ وہ قوتِ روحانی ہے جو اس کو تھڑے دل کے اندر اللہ تعالیٰ
نے ودیعت فرمائی اور جو انسانی ہستی کا ایک چپو ہے۔ کہ جس طرف پھر جائے
اسی طرف زندگی کا موڑ پھر جاتا ہے۔ اگر دل نیکی کی طرف پھر گیا۔ تو انسانی تمام
اعمال و افکار نیکی کی طرف پھر جاتے ہیں۔ اور اگر بدی کی طرف رخ دل کا ہو گیا۔
تو پھر تمام حرکات و سکنات اور خیالات بدی کے بہاؤ میں بہنے شروع
ہو جاتے ہیں۔

قرآن حکیم نے اس قلب کو بڑی اہمیت دی ہے۔ نُنزِلُ عَلٰی قَلْبِكَ
لِتُكْوِنَ نَذِيرًا لِلْعَالَمِينَ۔ کہ تیرے پر قرآن حکیم اس لئے اتارا تاکہ تو

ساری دنیا کو ڈرانے والا ہو۔

کہیں "قلب منیب" اور کہیں "قلب سلیم" بنانے پر توجہ دلائی گئی اور قلب سلیم اور قلب منیب پر زندگی کی کامیابی اور ناکامیابی کا مدار رکھا۔
 صبطوحی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تفسیر باین الفاظ بیان فرمائی۔

اَلَا فِي الْجَسَدِ مُضَغَةٌ اِذَا
 صَلَحَ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ
 وَاِذَا فَسَدَ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ
 اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ۔

ہاں جسم میں ایک اور تھڑا گوشت کا ایسا
 حصہ ہے کہ اگر وہ اچھا (اصلاح یافتہ) اور
 درست ہو تو تمام جسم اچھا اور درست
 ہے۔ اور اگر وہ خراب ہو۔ تو تمام جسم
 خراب ہے۔ ہاں وہ دل ہے۔

صرفیائے کرام نے اسی وجہ سے اپنے افعال و حرکات وغیرہ امور کی
 مرکزیت کو قلب قرار دیا۔ اور اپنے تمام مشاغل کا اسے مدار علیہ رکھا اور اپنی
 اصلاح اور اپنی زندگی کی اصلاح کے لئے بفرمودہ خدا اور بفرمودہ نبی کریم
 صلی اللہ علیہ وسلم اسی قلب کی اصلاح پر اپنی توجہات صرف کر دی۔ اور
 اسے زندگی کا تخم تصور کرتے ہوئے اسی کی آبیاری کو اپنی زندگی کا محور خیال
 کیا۔ جہاں دوسری دنیا کے علم نے اپنی زندگیاں بلند کرنے کے لئے اپنے دماغ
 کو بلند کرنا اور اپنے علم کو بلند کرنا مقصود بالذات تصور کیا۔ اور مشاہدہ قلبی
 پر علمی استدلال کو پست کیا۔ حالانکہ مذہب کی بنیاد علم و استدلال پر نہیں۔
 بلکہ مشاہدات و کیفیات قلبی پر مدار ہے۔ کوئی مذہب بھی علمی استدلال پر اولاً

س آیا۔ بلکہ مشاہدات روحی کے بعد جو علم عطا ہوا۔ اس پر بنیاد مذہب پیدا
 رہی۔ یہ وہ نکتہ ہے۔ کہ اگر ذہن میں آجاوے تو آسانی سے یہ تمام مسائل
 علمی دنیا اور روحانی دنیا میں الجھاؤ پیدا کر رہے ہیں۔ خود اٹھ جائیں۔
 لیکن دیکھئے علمی دنیا نے کبھی بھی اس نکتہ اور اس مرکزیت مذہب پر اتنی
 توجہ نہیں کی۔ بلکہ امور مابعد الذہب پر توجہ ڈال کر علمی دنیا کو مسخر کرنے
 کے لئے زور تمام صرف کر دیا۔ اور دنیا کے عالم سے زیادہ فائدہ اٹھانا اپنا
 مقصد حیات خیال کیا۔ بخلاف اہل اخلاص اور اہل تقویٰ کے۔ کہ وہ دنیا کو
 غصہ زندگی خیال نہیں کرتے۔ اور نہ ہی دنیا سے مایحتاج سے بڑھ کر کچھ
 اپنا پسند کرتے ہیں۔ بلکہ دنیا سے بڑھ کر آخرت پر اپنا دھیان رکھتے ہیں۔ اور
 دنیا کو ایک پل خیال کرتے ہوئے اس پر ڈیرہ ڈالنا نہیں چاہتے۔

زندگی کے دو نظریے

غرض زندگی کے دو نظریے ہیں۔ ایک دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور
 دوسرا دنیاوی زندگی کو اچھے بنانے پر آخرت کا مدار خیال کرتے ہیں۔ اور دوسرے
 آخرت کو مقدم رکھ کر دنیا کو آخرت کے لئے ایک ذریعہ خیال کرتے ہیں کیونکہ
 آخرت کی زندگی اصل زندگی۔ اور دنیاوی زندگی ایک وقتی زندگی پسند
 روزہ ہے۔

سرسری نگاہوں سے یہ بات آسان معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقتاً اس فرق کو
 سلیم کرنا۔ اور پھر اس فرق کے مطابق کسی زندگی پر اپنا زور لگانا اور اس کے مطابق

فلاح سے بلند ہونا ایک بنیادی فرق ہے لیکن بہت کم لوگ ہیں جو اس فرق کو سمجھتے ہوئے ”محو زندگی“ کے تصورات کو الگ الگ کر دیکھیں۔

۶ فکر پیرس بقدر ہمت اوست

ذکر اللہ - جہاں ذکر اللہ کی بہت بڑی اہمیت اہل دل میں ہے۔ وہاں علمائے کرام کی اہمیت دوسرے اذکار اور صوم و صلوات سے کچھ زیادہ نہیں بلکہ موجودہ وقت کے علمائے کرام تصوف کی دنیا کے ذکر سے بدکتے ہیں۔ اور ذکر اللہ کو عام علمی دنیا کے مطابق ایک بے فائدہ خیال کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ صرف ذکر اللہ کیا اور کس کام کا جب اعمال کو درجہ اول نہ دیا جائے۔ بلکہ اب تو اعمال سے بڑھ کر جب تک یہ جذبہ حکومت الہیہ کا اندر جوش زن نہ ہو اور اس جذبہ کے مکمل کرنے کے لئے ایک جنون پیدا نہ ہو جائے۔ اس وقت تک تمام اعمال باقیات الصالحات کی کوئی قیمت اور کوئی وزن نہیں۔ اور صالحین امت کو ایک بیکار امت کے افراد خیال کرنے کو پھیلا یا جانا اپنا فریضہ خیال کرتے ہیں۔ اور پورے دنیا دار علمی کی طرح اللہ اللہ کرنے کو ایک فعل عبث ہی خیال نہیں کرتے۔ بلکہ ملت کے لئے ایک ننگ اور عار خیال کرتے ہیں لیکن جہاں تک قرآن حکیم کو پڑھا جاوے۔ ذکر اللہ کے لئے بہت کچھ آجانا ہے۔ اور ذکر اللہ کی اہمیت تمام اعمال صالحہ سے بڑھ کر نظر آتی ہے۔ بلکہ اعمال صالحہ کی جڑ ہے۔

سب سے پہلے اسی آیت زیر غور کو دیکھئے کس طرح وَاَصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ سِیِّئَاتٍ مِّنْهُم

کی گئی۔ ایک رسول امت کو ان افراد امت کے پاس بیٹھنے کا ارشاد ہوتا ہے۔
جو اللہ صبح و شام کرتے ہیں۔

اس کے بعد دوسرے فقرے آیت کو دیکھئے۔ فرماتے ہیں۔

وَلَا تُطِيعُ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ
عَنْ ذِكْرِنَا۔
جس کا دل ہمارے ذکر سے غافل ہو اس
کی اطاعت مت فرمائیے گا۔

ایک طرف اللہ اللہ کرنے والوں کے ساتھ بیٹھنے کا حکم ہوتا ہے اور
دوسری طرف جو اس کی یاد سے غافل ہیں۔ ان کی تابعداری کو حرام قرار دیا جاتا ہے۔
لیکن ہمارے علم و دست بزرگ اپنی علمیت کی وجہ سے مصلحتیں اس حکم شریف
سے نہیں ہوتے۔ بلکہ تاویلات و تاویلات میں جا کر ذکر کو نماز اور دیگر اعمال صالحہ

کی شکل دیتے ہیں۔ اس لئے ہم کچھ آیات پیش کر کے فیصلہ آپ پر چھوڑ دیتے ہیں۔
رَا فَادْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ
اٰبَاءَكُمْ اَوْ اَشْدَّ ذِكْرًا
تم حق تعالیٰ کا ذکر کیا کرو جس طرح اپنے اباؤ
اجداد کا ذکر کیا کرتے ہو۔ بلکہ اس

سے بدرجہا بڑھ کر۔ (تھانوی)

دیکھئے کتنے صریح الفاظ میں حکم ذکر ہے۔ اور کوئی دوسرا ذکر اس کے اندر
آہی نہیں سکتا۔ کیونکہ کَذِكْرِكُمْ اَبَاءَكُمْ اَوْ اَشْدَّ ذِكْرًا کی قید
تمام دیگر اذکار سے الگ کر کے صرف اللہ کے نام کے بلند ذکر کا تصور پیش
کرتی ہے۔

لیکن ملاحظہ ہو حاشیہ۔

”آیت میں جو حکم یاد کا فرمایا۔ اس میں نمازیں بھی داخل ہیں۔ پس یہ ذکر تو واجب

ہے۔ باقی مستحب۔

اب غور فرمائے اصل ذکر کو کس طرح پڑپ کیا گیا۔ اور اس کی اہمیت کو کتنا کم اس حاشیہ کے ذریعہ کر دیا گیا۔

(ب) الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ
قِيَمًا وَقَعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ
وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں کھڑے
بھی۔ بیٹھے بھی۔ لیٹے بھی۔

دیکھئے وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ کی قید سے نماز ذکر سے نکل گئی۔ اور اصل ذکر جو بیٹھے۔ کھڑے۔ لیٹے ہو سکتا ہے۔ وہی سامنے آگیا۔ یعنی ذکر اللہ۔

(ج) وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ
فَصَلِّ (سورہ اعلیٰ)
اپنے رب کا نام لیتا ہے۔ اور نماز پڑھتا ہے۔

دیکھئے۔ نماز کے ذکر سے دوسرا ذکر الگ ہو گیا۔ اور یہی ذکر اللہ مردے بغیر کوئی دوسرا ذکر اس جگہ نہیں لایا جاسکتا۔

(د) وَاذْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً
وَأَحْيَا (سورہ دھر)
اور صبح و شام اپنے پروردگار کا نام لیا کیجئے

اس آیت میں کھنے طور پر اسْمَ رَبِّكَ فرما کر تمام شکرک مطاویع گئے
(ه) وَاذْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ
اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو۔ اور
وَتَبَيَّنَ إِلَيْهِ تَبْيِيْلًا (مزل)
سب سے قطع کر کے اس کی طرف متوجہ رہو۔

یہاں بھی ”اسْمَ رَبِّكَ“ سے اللہ کے ذکر کو ذکر نام سے پڑھنا کہا گیا۔
(و) فِي يَوْمٍ أَذِنَ اللَّهُ أَنْ
وہ ایسے گھروں میں جا کر عبادت کرتے

تُرْفَعُ وَيُذَكَّرُ فِيهَا اسْمُهُ جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ادب
کیا جاوے۔ اور ان میں اللہ کا نام لیا جاوے۔ (الغور: ۳۶)

مسجدوں میں عبادت خانوں میں ذکر اللہ کرنے کی وجہ سے شرف دلایا گیا۔
رَبِّ يَذَكَّرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ خلوت خانوں۔ عبادت خانوں۔ اور
كَثِيرًا (سورہ حج) مساجد جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا

جاتا ہے۔

رَبِّ تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ بڑا بابرکت نام آپ کے رب
ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ کا ہے۔ جو عظمت والا اور احسان
(الرحمن ۷۸) والا ہے۔

یہ آیت صریح بیان کرتی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا نام بڑا بابرکت ہے۔ اب جو علمی
دنیا اللہ اللہ کہنے کو بے کار خیال کرتی ہے وہ ان آیات پر دھیان سے۔

ان آیات کے علاوہ بلند آواز۔ اور آہستہ ذکر کرنے پر بہت سی آیات
ہیں۔ جو ذکر کے طریقہ کو بیان کرتی ہیں جنہیں طوالت کے لئے ہم چھوڑتے ہیں۔
ایسی آیات اور موجودہ تحریر کے مطالعہ پر دھیان کرنے سے صاف ذکر
کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ اور تصوف کا نقطہ صاف ہو جاتا ہے۔ پھر خود ہی
آیات فیصلہ کرتی ہیں کہ ذکر کیا فائدہ دیتا ہے۔

قائده ذکر

الَّذِينَ آمَنُوا وَقَطَّعُوا
وہ لوگ سنیں ہیں جو ایمان لئے اور

قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَا
بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ۔
دلوں کو اطمینان (آرام) ہو جاتا ہے۔

ذکر کا فائدہ بھی بیان فرما دیا۔ کہ ذکر اللہ دلوں کو اطمینان اور آرام دیتا ہے۔
اور یہی کچھ حاصل دین و دنیا کا ہوتا ہے۔ دل مصنف ہو کر مطمئن ہو جاوے اور خواہشات
نفسانی کم ہو جاویں۔ اور وساوس دنیاوی اٹھ جاویں۔ خواہشات روکنے کے
لئے ذکر اللہ ایک بہت بڑا علاج ہے جن لوگوں نے اس نسخہ ذکر کو استعمال
کیا۔ ان کے عادات، اخلاق، اطوار غرض جب دل کی دنیا بدل گئی۔ تو باقی افعال
و حرکات خود بخود بدل گئے۔ اور نفس مطمئنہ حاصل ہو گیا۔

ذکر کثیر

اطمینان حاصل کرنے کے لئے ذکر کثیر بہت زیادہ ذکر کی ضرورت ہے
اور جیسے آیات ماقبل سے ثابت ہو چکا ہے۔ کھڑے۔ بیٹھے۔ لیٹے ذکر کرنے
رہنے صاحب ہوش و عقل کا کام ہے۔ اس لئے رشد حاصل کرنے والوں کے
لئے ذکر کثیر لازم کر دیا گیا۔ صوفیائے کرام کا قول ہے۔ کہ دل بجز ذکر کثیر نہیں کشا
ر کہ بہت ذکر کے سوا دل نہیں کھلتا، حضرت سلطان باہو فرماتے ہیں:-

الف۔ اللہ چنبے دی بونی مرشد دل میرے وچ لائی ہو

نفسی اشبات واپانی بلوسس ہر رگ ہر جانی ہو

اندرو بونی مسفک مجایا ہاں چھان تے آئی ہو

سوجب تک بہت ذکر نہ کیا جاوے۔ ذکر اپنا پھل نہیں لاتا۔
 صوفیائے کرام نے دل کی غفلت کا واحد علاج ذکر اللہ تجویز کیا ہے۔
 اور علمائے افعال حرکات درست اور مناسب کرنے کے لئے
 اعمال صالحہ پر زور دیا۔ تاکہ اعمال صالحہ کے ذریعہ قلب صاف ہو جائے۔
 لیکن وہی طریقہ الہیہ پہلا ہے۔ نہ کہ دوسرا

ابتدائی ذکر

ابتداءً تو ذکر پہلے زبان سے شروع ہوتا ہے۔ بلکہ بارشاد
 كَذِكْرِكُمْ اَبَاءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا بَلَد
 آواز سے سالک پڑھنے پر مجبور ہے۔ لیکن بعد میں جب ذکر اپنے ابتدائی
 مرحلہ سے نکل جاتا ہے۔ تو پھر اَدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَ
 خُفْيَةً ط میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور قیام۔ قعود۔ اور علیٰ جنوب بہم
 پر آ جاتا ہے۔ اور ہر سانس کے ساتھ خود بخود چلنا شروع ہو جاتا ہے۔

آخری ذکر

لیکن جب یہ ذکر سچتہ ہو جاتا ہے۔ تو پھر ذکر اس درجہ پر آ جاتا ہے۔ جس کا
 ذکر ہماری آیت زیر غور میں ہے۔ یعنی یاد اور صرف یاد۔ جہاں غفلت کا گذر
 کبھی بھی نہیں ہوتا۔ اور پھر یہ یاد صرف یاد نہیں رہتی۔ بلکہ یہ "یاد" آفتاب
 اکمل اللیل آفتاب۔ خود ذکر اپنے تمام اثرات سے جسم و جان میں چمکتے دکھنے

گتا ہے۔

بے شک یہ علمی علاج بھی صحیح ہے لیکن طریق کار الگ الگ ہوجانے کی وجہ سے یہاں تک ذہن نہیں پہنچتی چلا ہیٹے۔ کہ جو علاج صلحائے امت نے تجویز بحکم قرآن کیا ہے۔ وہ سراسر غلط ہے۔ اور اللہ اللہ کرنے سے کیا فائدہ۔

یہ خیال نہ کیا جاوے۔ کہ جو کچھ سوء ظن ظاہر کیا گیا ہے۔ غلط ہے۔ بلکہ یہ صورت حال مخلصین کے ہر فعل میں موجود ہے۔ کسی دوسری دلیل کی ضرورت نہیں۔ بے شک موجودہ صوفیت بھی کچھ اچھی صورت اپنی پیش نہیں کرتی۔ لیکن اس کمزوری کی وجہ سے اصل حقائق تصوف پر پھبتیاں اڑانا بھی صاحب علم و برکت کے لائق نہیں۔

میرے قبلہ مرشد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ ذکر کی تلقین کے لئے اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔

نصوّر دل میں رکھے ذاتِ حق کا
ہر وقت و بہر حال و بہر جا
زباں خاموش ہو پر دل میں جاری
رہے ہر وقت ذکرِ ذاتِ باری

اس وقت یہ مرد مجاہد پورا نمونہ رسالت ہوجاتا ہے۔ اور تخلقوا باحلاق اللہ کی صورت و سیرت کا نقشہ ہو کر امتِ محمدیہ کا رہبر ہو کر امت کو ضلالت اور گمراہی سے بچاتا ہے۔ اور رشد و ہدایت کا ایک مینار

ہو کر دنیا کے عالم کو صراطِ مستقیم کی روشنی دیتا ہے۔ اور اندھی دنیا کی بسینائی کا باعث ہوتا ہے۔ اور حَوَالِیْہِ مِنْ کُلِّ فِیْجٍ عَجِیْبِہِ ط ہر طرف سے اس کی طرف خلقت بکثرت لوٹتی ہے اور آتی جاتی ہے۔

ہول

ہوا کے معنی خواہش کے ہیں۔ جو ہر شہرت کے اندر سے بے انداز بے شمار پھوٹتی رہتی ہے۔ اور جس کے پھوٹنے سے نفسِ انسانی کو تو بیشک تقویت پہنچتی ہے۔ اور نفسِ انسانی موٹا تازہ ہوتا ہے لیکن نفسِ انسانی کی حقیقی موت کا باعث بھی یہی خواہش ہوتی ہے۔ جب ان کے اندر جوش آجاتا ہے۔ اور ایک خواہش کے پیچھے دوسری خواہش قطار در قطار نکلنی شروع ہو جاتی ہے۔ تو یہ خواہشات دل کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہیں۔ اور قلبِ مصطفیٰ کا خون جوس کر اس کو بے جان کر دیتی ہے۔ جس سے قلب کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اور قلب بے کیف ہو کر مر جاتا ہے۔ اور یہ موت حقیقی انسانیت کی موت ہوتی ہے۔ جیسے ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا
 اَنْفُسَهُمْ اَنْفُسَهُمْ۔
 ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو اللہ تعالیٰ کو بھول گئے۔ جس کی وجہ سے اپنے نفسوں کی حقیقت کو بھول گئے۔ بھلا جو اپنے آپ کو بھول جائے وہ ایسی خیر (اللہ کی یاد) کیسے پاسکتا ہے۔

اہل تصوف کا یہ دوسرا حقیقی اور بنیادی مسئلہ ہے۔ کہ خواہشات

نفسی کو کلی طور پر رضائے اور قربِ الہی حاصل کرنے کے لئے روکا جائے تاکہ دل ان خواہشات سے رُک کر صرف ذاتِ حقِ سبحانہ کی طرف رجوع کرے اور اس کے دیکھنے کی تڑپ پیدا ہو جائے۔

خود سوچئے کہ جب یہ مقولہ مشہور ہے۔ کہ دو دل برون بجز بے حالی نیست۔ دو دل ہونا کچھ پیدا نہیں کرتا۔ لیکن جب خواہشات ان گنت نفس پر آجائیں تو پھر کیسے حقِ سبحانہ کی طرف وہ توجہ ہو سکتا ہے۔ عام خیال ہے کہ دنیا نام ہے خواہشات کا۔ اور دنیا ان خواہشات نفسی سے زندہ اور پُر رونق ہے۔ اگر یہ دہوں۔ تو کارخانہ قدرت بیکار ہو جائے۔

ایک اعتراض کہ تصوف سے دنیا ویران ہو جائیگی

بعض دنیا کے بندے اعتراض کرتے ہیں۔ کہ اہل تصوف کے جہاں میں آنے سے تو دنیا ویران ہو جائے گی۔ اور یہ جگ باطل ٹھیرے گا۔ اللہ تعالیٰ کے پاک بندے خود فرماتے ہیں۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا

لیکن یہ نہیں سوچتے۔ کہ ساری دنیا کی طبیعت کیسے یہ جذبہ قبول کرتی ہے خالق الارض والسماء نے ہر انسان کی فطرت الگ الگ بنائی۔ اور اس فطرت کے مطابق عالم دنیا میں وہ کام کرتا ہے۔ اور اس فطرت کے مطابق اپنے خیال ڈھالنا اور ان خیال پر چلنا اپنی زندگی خیال کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تمام انسانی دنیا الگ الگ پیشوں میں تقسیم خود ہو گئی۔

اور خاتم نبی اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت بالغہ اپنی بلند ہے۔ کہ حسب ضرورت دنیا تبدیل و تغیر خیالات ہوتے ہیں۔ اور حسب ضرورت دنیا ان خیالوں میں ڈھل کر مختلف انواع اور مختلف خدمات کے لئے اپنے آپ کو تیار کیا جاتا ہے۔ اور وہی اپنے مناسب خیال کیا جاتا ہے۔ دنیا ئے عالم میں اپنا حصہ وہ خدمت گزار ہو کر ادا کرتا ہے۔

لیکن جیسے کہا گیا۔ کہ حسب ضرورت فطرتاً اشیا پیدا ہوتے ہیں اور جن اشیا کی ضرورت کم ہے۔ وہ اشیا ہی کم پیدا ہوتے ہیں۔ اور جن کی ضرورت زیادہ ہے زیادہ پیدا کئے جاتے ہیں۔ غلہ کی ضرورت زیادہ ہونے کی وجہ سے انسانی ہستی کو کاشتکاری کی توجہ زیادہ دی گئی۔ بخلاف باغبانی کے۔ اس کی طرف کم رجوع دلایا گیا۔ اور باغبانی کی طرف توجہ نسبتاً کم کی جاتی ہے۔

سورج اور چاند صرف ایک ایک ہے۔ ایک دن کے لئے اور ایک رات کے لئے۔ لیکن ستارے زیادہ بنائے گئے۔ ستاروں سے کچھ اور کام لینا تھا۔ جن کی ضرورت زیادہ تھی۔ لیکن سورج ایک ہی بنایا گیا۔ ورنہ اس کی قدرت تو سینکڑوں سورج بنا سکتی تھی۔ اسی طرح چاند بھی کئی بنائے جاسکتے تھے۔ لیکن ایک پر اکتفا کیا گیا۔ آفتاب رسالت تو صرف ایک تمام امت کے لئے خاتم الرسل نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منتخب فرمایا گیا۔ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَّشَاءُ لٰكِنْ سَتَأْتِيَ كَثِيْرًا مِّنْهُمُ الْغَيْبُ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَّشَاءُ لٰكِنْ سَتَأْتِيَ كَثِيْرًا مِّنْهُمُ الْغَيْبُ اور اولیائے امت ان گنت فرمائے گئے۔ اور فرمائے جائینگے۔

اور پھر ہر ایک کی طبع کو الگ فطرتوں پر ڈھالا گیا۔ گو کام ایک ہے لیکن حسب ضرورت ان کی طبیعتوں کو الگ الگ بنا کر نیا نئے عالم کو روشن فرمانے کی تجویز فرمائی گئی۔

لیکن جیسے سارے عالم کو ستارے اور ماہتاب نہیں بنایا گیا۔ ایسے ہی ساری دنیا کو ولی اللہ بنانے کی مشیت نہیں۔ اور کوئی انسان اپنی فطرت کے سوا کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ ایسے ہی ہر آدمی کی فطرت ولی اللہ بننے اور اللہ الشکر کرنے کی نہیں۔ ورنہ دنیا میں کوئی کافر نہ ہوتا۔ مگر کافر دنیا میں بہت زیادہ اور مسلمان بہت کم ہیں۔

ایسے ہی تصوف کی دعوت پر یہ نہ کہنا چاہیے۔ کہ یہ دنیا کو بے کار بنا کر دنیا کو ویران کرنا چاہتے ہیں۔ یا یہ خواہشات کو مٹا کر دنیا کو بیکار بنانا چاہتے ہیں۔

بے شک اس دنیا سے چند آدمیوں کو اٹھا کر اور الگ کر کے اُس دنیا (آخرت) کے لئے مشعل راہ ہدایت بنانے کے لئے خواہشات نفسی کو بند کر کے عام تقاضوں سے الگ کر کے "فطرتِ الہیہ" کے عکس حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اور وہ کوئی بلند ہمت ہوتا ہے جس کی فطرت دنیاوی عالم سے اٹھ کر عالم بالا کی طرف اُٹے۔ اور کنگرہ افلاک پر بیٹھ کر تقدیس و تہلیل حق سبحانہ کا حق ادا کرے۔ اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ کسی دوسرے کے حصہ میں یہ دولت نہیں۔ بلکہ حسب ضرورت ہر انسانی فطرت کے لئے ہدایت اور رُشد کی ضرورت ہے۔ اور اسی کے مطابق

وہ دنیا سے بے تعلق ہوتے ہیں۔ اور خواہشاتِ نفسی کو روکتے ہیں اور دنیا کے لئے یہ لوگ مبارک ہوتے ہیں اور جیسے سورج کے بغیر کام نہیں چلتا۔ اور آنکھیں راہ نہیں دیکھ سکتیں۔ ایسے ہی ان پاک ہستیوں کے سوا صراطِ مستقیم کا سامنے آنا محال ہو جاتا ہے۔

زندگی جدوجہد کا نام ہے۔ ایک
 جدوجہد دنیاوی ہے اور دوسری
 روحانی۔ دونوں کی وسعت لے پایاں
 ہے۔ اور دونوں کے اکٹھے کرنے
 کا نام اسلام ہے۔ یہی بنیاد ہماری
 تخریب کی ہے۔

عمر بیرویلوی



تصوف کو شناسا کرنے کے لیے معیاری
ادب تصوف کا شائع کرنا۔ اور کتب قدیم
کو از سر نو مرتب کر کے پیش کرنے کے
لئے ادارہ تصوف وجود میں آیا۔

آپ بھی اگر تصوف سے دلچسپی رکھتے ہیں
تو تعاون فرمائیے۔ اس ادب کا مطالعہ
کیجئے۔ اور اچھے مقالے اور مضامین تصوف
لکھ کر بھیجئے۔ اور اپنے خاص مشوروں سے
ممنون فرمائیے۔

عمر بیروبی

انوار الہدیٰ فی سیرۃ المصطفیٰ

سیرت سرورِ کونین علیہ الصلوٰۃ والسلام پر سینکڑوں کتابیں موجود ہیں۔ مصنف کا اپنا اپنا ایک نظریہ ہے۔ جس کے پیش نظر سیرت کا باغ سجایا گیا۔ اور عام طور پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عملی زندگی کو پیش کیا گیا۔ لیکن سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں جو عظیم القلاب قائم فرمایا۔ اس کی طاقتور روح کیا تھی۔ یعنی رسالت اور نبوت کیسے ہے اور اس کے انوار کس طرح انسانی قلوب کو مسخر کرتے ہیں۔ اور دنیا و مافیہا سے بے نیاز کر کے خالق مطلق کی طرف کس طرح متوجہ کرتے ہیں۔ اس حقیقت کو بہت کم پیش کیا گیا۔ کیونکہ یہ عظیم کام صاحبِ حال بزرگوں کا ہے اور جب بلند احوال پیدا ہو جائیں تو قلم اپنا کام چھوڑ دیتا ہے۔

ع کا اثر کہ خبر شد خبرش باز نیامد

اس لیے عموماً یہ میدان خالی رہا ہے۔ اس آخری دور میں اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے جناب محترم مولانا حاجی فضل احمد صاحب مدظلہ کو منتخب فرمایا۔ سیرت کا جو بہترین مفاد ہے۔ وہ تاثیر ہے۔ آپ انوار الہدیٰ کے مطالعہ سے محسوس کریں گے کہ تاثیرات سے آپ کا سینہ منور ہو رہا ہے۔ جلد اول تیار ہے۔ اولیں فرصت میں مطالعہ کریں شاید کہ دلی اجری سستی آباد ہو جاوے۔

منجانب
مہتمم ادارہ تصوف نظام بلدنگ موہنی روڈ۔ لاہور

انقلاب الحقیقت فی التصوف والطریقت

المعروف به

دستور تصوف

تصوف پر موجودہ زمانے میں کوئی ٹھوس کتاب نہیں لکھی گئی۔ سابقین کی کتابوں کے تراجم اور ان کی زندگی کے حالات ہیں جو لٹے لٹے رنگ میں پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ دستور ہے کہ ہر زمانے میں ہر طرح کی ہدایت کا سامان مہیا فرماتا ہے۔ تصوف کے احوال و انوار جو ہدایت کی جان ہیں۔ اس آخری دور میں ان کا تفصیلی ذکر نہ ہوتا یہ ممکن نہ تھا۔

آحمدلہ کہ لٹے اسلوب سے تصوف کی تمام باریکیاں اور سالک کے ابتدا سے انتہا تک کے تمام احوال :- شوق - تلاش و جستجو - مرشد کامل کی شناخت اور یافت - تربیت اور خطرات سے آگاہی اور نتائج تربیت کشف و کرامات اور مقبولیت عامہ وغیرہ کو قطب العالم محبوب الہی

حضرت مرشدنا صاحبزادہ محمد عمر صاحب مدظلہ نے لہایت عمدہ پیرایہ میں لکھا ہے بظاہر یہ آپ بیتہ معلوم ہوتی ہے۔ یا پھر غوث زمان حضرت میاں شیر محمد صاحب رحمۃ اللہ کے حالات زندگی - لیکن فی الحقیقت اس پردے میں حقائق الہامیہ بول رہے ہیں اور ایک طالب مولا کے لئے ساری زندگی کا دستور العمل آسان اور سہل عبارت میں اور لہایت دلچسپ پیرائے میں موجود ہے۔

کتاب کی دو جلدیں ہیں پہلی جلد میں تربیت سالک کا تفصیلی ذکر ہے اور دوسری جلد میں تربیت کا مکمل بیان ہے۔ کتاب ختم ہو چکی تھی ادارہ تصوف اس اکمیر اعظم کو دوبارہ شائع کر رہا ہے۔ انشاء اللہ عنقریب شائقین اور طالبین ملاحظہ فرمائیں گے۔

منجانب :-

ادارہ تصوف نظام بلڈنگ - موہنی روڈ لاہور

تمام سلوک کا خلاصہ

ایک کامل سالک کی وعایا بارگاہ ربوبیت میں

قبلہ عالم محبوب الہی وام ظلہ نے اپنے خصوصی اوقات میں بارگاہ الہی میں پروردگار سے ایک صد انکالی جوشعار کی صورت میں زبان مبارک سے نکلی الحمد للہ تمام تصوف کا خلاصہ اور سالک کے تمام انتہائی اور ابتدائی احوال اس وعایا میں آگئے۔ ہر سالک کیلئے مہمنا اور بلوران سلسلہ کیلئے خصوصاً یہ ضروری ہے کہ غلبہ جمال کی صورت میں الہی الفاظ میں اپنی التجا بارگاہ رب العالمین میں پیش کی جائے انشاء اللہ ایک عجیب کیفیت رونما ہوگی۔



ذکر تیرے سے رہنے مہمور میری گفتگو
تا کہ میں سب بھول جاؤں جو کہ پیسے سوا
اور تیرے ماسوا ہرگز نہ ہو مجھ کو عزیز
شکر تیری نعمتوں کا میں ادا کرتا رہوں
پھر تجلی طور کی ہر دم رہے اس پر سدا
تاقانے قلب سے لذت اٹھاؤں کہ عجب
جسم پر لڑ رہے و رول میں تیرا ڈر رہے
یہے نیاز می تیری کا کھٹکا ہے اے بے نیاز
میں مٹوں سارے کا سارا اور مٹ جائے بھی نام

و بدم تیرا تصور ہی رہے اور جستجو
کہ محبت ذات اقدس کی مجھے یارب عطا
نیک بدبختی کی اٹھ جائے بھی مجھ سے تیز
یا الہی میں تیری حمد و ثنا کرتا رہوں
اتھکھ میری بند ہو اور قلب ہو میرا کھلا
موت پہلے ہی مرنا مجھ کو ہو جائے نصیب
خوف تیرے سے ہمیشہ چشم میری تر ہے
ساتھ ہی دعویٰ محبت کا ہے یا عرونا
مطلع الانوار سینہ میرا ہو جائے تمام

قُلْ هُوَ اللَّهُ يَاحَدُّكَ بِرُحْمِكَ تَفْلُحُ
 وصل تیرا ہو میرے تکلیف ہے قیاس
 سنت خیر الورا کی بھی ملے مجھ کو لو
 آنکھ میری دیکھ لے پھر نور اس محبوب کے
 حقیقت دیکھ کر پھر ہو حقیقت کل عیاں

کچھ نہ ہو کھٹکا کہ میرا کوئی ہے فرزند و نون
 ایک ظاہر میں ہے تیری شریعت کا لباس
 ہنس پر میں کہوں یا مصطفیٰ یا محتبی
 اور حجاب اٹھ جائے سارا اس رخ پر نور سے
 جس کے کہنے سے لرز جائے زبان ناتواں

موت گرا جائے آسانی سے ہو میرا گزر
 ہاں مسلمان ہو کے جاؤں اس جہاں سے خدا

جیسے کوئی پل سے گزے یا کہ راہِ خط
 بندگانِ خاص میں پھر رکھو مجھ کو لے شہا

عصمت و عفت تیری کی بھی ملے مجھ کو روا
 نفسِ تارہ پہ قابو دے تو اے قادرِ کریم
 اک گھڑی یا اس کم بھی مجھ کو اپنے پر چھوڑ
 ماں سے بڑھ کر تو ہو اور ہو باپ سے بڑھ کر بھی
 رات دن تیرا تخیل ہی ہے مجھ کو مدام
 تو بھی میرا ہو ہے اور میں بھی تیرا ہو ہوں
 نیرے کانوں سے سنوں گریں سنوں کے اگر دکار

کیونکہ یہ بدکار اب تو ہے بہت رسوا ہوا
 تیری رحمت کے سوا چارہ نہیں اب تو رحیم
 یا الہی بجز عصیاں میں مری کشتی نہ توڑ
 یار و مونس میرا تو ہو اور سب کچھ تو ہی تو
 اک گھڑی بھی آئے نہ مجھ کو سوا تیرے رام
 تیری حدت ذات میں ہو مجھ میں جہوں میں
 تیری ہی آنکھوں سے دیکھوں گریں دیکھوں بار

کچھ ارادہ ہو نہ میرا گرا ارادہ میں کروں
 جو ارادہ تو کرے، وہ پھر ارادہ میں کروں

رنگزار عالم پریس لاہور

دستور تصوف

تصوف پر موجودہ زمانے میں کوئی ٹھوس کتاب نہیں لکھی گئی۔ سابقین کی کتابوں کے تراجم اور انکی زندگی کے حالات ہیں جو نئے نئے رنگ میں پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ دستور ہے کہ ہر زمانے میں ہر طرح کی ہدایت کا سامان مہیا فرماتا ہے۔ تصوف کے احوال و انوار جو ہدایت کی جان ہیں۔ اس آخری دور میں ان کا تفصیلی ذکر نہ ہوتا یہ ممکن نہ تھا۔

الحمد للہ کے نئے اسلوب سے تصوف کی تمام باریکیاں اور سالک کے ابتدا سے لیکر انتہا تک کے تمام احوال: شوق تلاش و جستجو۔ مرشد کامل کی شناخت اور یافت۔ تربیت اور خطرات سے آگہی اور نتائج تربیت، کشف و کرامات اور مقبولیت عامہ وغیرہ کو قطب العالم محبوب الہی حضرت مرشدنا صاحبزادہ محمد عمر صاحب مدظلہ نے نہایت عمدہ پیرایہ میں لکھا ہے بظاہر یہ آپ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ یا پھر غوث زمان حضرت میاں شیر محمد صاحب رحمہ اللہ علیہ کے حالات زندگی۔ لیکن فی الحقیقت اس پردے میں حقائق الہامیہ بول رہے ہیں اور ایک طالب مولا کے لئے ساری زندگی کا دستور العمل آسان اور سہیل عبارت میں اور نہایت دلچسپ پیرائے میں موجود ہے۔

کتاب کی دو جلدیں ہیں پہلی جلد میں تربیت سالک کا تفصیلی ذکر ہے اور دوسری جلد میں تربیت کا مکمل بیان ہے۔ کتاب ختم ہو چکی تھی ادارہ تصوف اس افسوسناک طور کو دوبارہ شائع کر رہا ہے۔ انشاء اللہ عنقریب شائقین اور طالبین ملاحظہ فرما سکیں گے۔

منجانب

ادارہ تصوف نظام بلڈنگ۔ موہنی روڈ لاہور

دستور تصوف

تصوف پر موجودہ زمانے میں کوئی ٹھوس کتاب نہیں لکھی گئی۔ سابقین کی کتابوں کے تراجم اور انکی زندگی کے حالات ہیں جو نئے نئے رنگ میں پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ دستور ہے کہ ہر زمانے میں ہر طرح کی ہدایت کا سامان مہیا فرماتا ہے۔ تصوف کے احوال و انوار جو ہدایت کی جان ہیں۔ اس آخری دور میں ان کا تفصیلی ذکر نہ ہوتا یہ ممکن نہ تھا۔

الحمد للہ کے نئے اسلوب سے تصوف کی تمام باریکیاں اور سالک کے ابتدا سے لیکر انتہا تک کے تمام احوال: شوق تلاش و جستجو۔ مرشد کامل کی شناخت اور یافت۔ تربیت اور خطرات سے آگہی اور نتائج تربیت، کشف و کرامات اور مقبولیت عامہ وغیرہ کو قطب العالم محبوب الہی حضرت مرشدنا صاحبزادہ محمد عمر صاحب مدظلہ نے نہایت عمدہ پیرایہ میں لکھا ہے بظاہر یہ آپ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ یا پھر غوث زمان حضرت میاں شیر محمد صاحب رحمہ اللہ علیہ کے حالات زندگی۔ لیکن فی الحقیقت اس پردے میں حقائق الہامیہ بول رہے ہیں اور ایک طالب مولا کے لئے ساری زندگی کا دستور العمل آسان اور سہیل عبارت میں اور نہایت دلچسب پیرائے میں موجود ہے۔

کتاب کی دو جلدیں ہیں پہلی جلد میں تربیت سالک کا تفصیلی ذکر ہے اور دوسری جلد میں تربیت کا مکمل بیان ہے۔ کتاب ختم ہو چکی تھی ادارہ تصوف اس افسوسناک واقعہ کو دوبارہ شائع کر رہا ہے۔ انشاء اللہ عنقریب شائقین اور طالبین ملاحظہ فرما سکیں گے۔

منجانب

ادارہ تصوف نظام بلڈنگ۔ موہنی روڈ لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الان کا تصور

تصوف کے آئینہ میں

انگلہ

جانِ حقیقت حضرت قبلہ صاحبزادہ محمد عمر صاحب مدظلہ

(پہریل شریفہ - ضلع سرگودھا)

الان کا تصور

نظام ایفنگ - موہنی روڈ - لاہور

451/2